مئی 2005

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

امتحان! امتحان! امتحان!

امتحان کا وقت آتے ہی بچے مسلسل بڑھتی مسابقت، والدین کے دباؤ اور سخت محنت کے باعث ہراساں ہو جاتے ہیں۔ امتحان کی وجہ سے طالب علموں کی بڑھتی خودکشی خطرے کی گھنٹی ہے۔ آخر اس کے اسباب کیا ہیں اور تعلیمی سطح پر کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

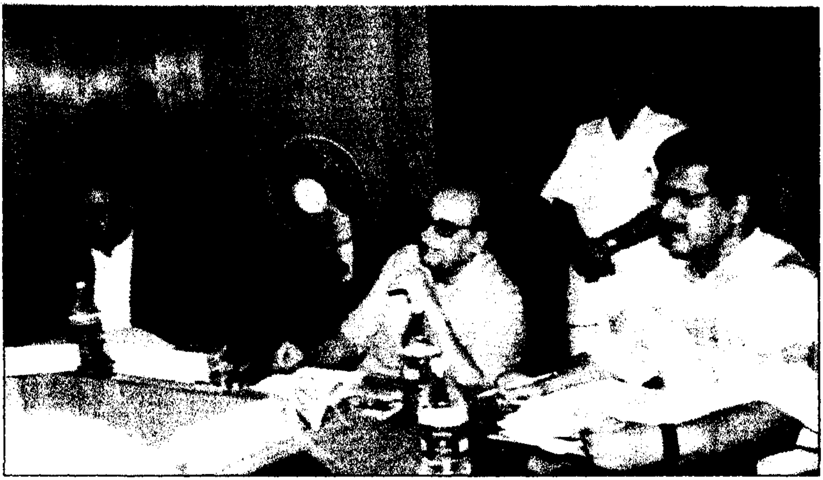

قومی اردو کونسل کی سالانہ میٹنگ وزارت ترقی انسانی وسائل کے کمیٹی روم نمبر 112، سی ونگ، فرسٹ فلور، شاستری بھون میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، جناب ارجن سنگھ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند اور جناب شمس الرحمن فاروقی وائس چیئرمین قومی اردو کونسل۔

اسی موقعے پر لی گئی ایک اور تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، پروفیسر نسیم بھاٹیہ وائس چانسلر جودھپور یونیورسٹی، پروفیسر قمر رئیس، جناب اقبال مجید، جناب پی۔ اے۔ انعامدار، جناب اسد زیدی اور جناب سعید نقوی۔

ماہنامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔5 مئی 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپیہ، سالانہ -/100 روپیے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات	خطوط	2
ہماری بات	اداریہ	5
● امتحان کا خوف (گیسٹ کالم)	ابھیشیک راجا	6
● دکنی لغت	سیدہ جعفر	9
● حیدرآباد اور اردو صحافت	رشید الدین	13
● دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال	فیروز بخت احمد	15
● زبان اور تحریر کا سفر	اظہار اثر	17
● طلبہ کے لیے ایک سیٹلائٹ	این گوپال راج	22
● جوہری توانائی کی فراہمی کا درخشاں منصوبہ	عبدالعلیم قدوائی	25
اتہاس کے جھروکے سے:		
● گپت سلطنت	مدن گوپال	27
گوشۂ ادب:		
● چادر (افسانہ)	سلام بن رزاق	29
● سلام بن رزاق سے گفتگو	فیروز عالم	35
● دہلی اردو کتاب میلہ (رپورتاژ)	منظور عثمانی	38
گوشۂ فروغ کتب		
● فنِ الیہ نگاری ("کلاسیکی یونان: تہذیب، فلسفہ، فنونِ لطیفہ" سے اقتباس)	حبیب حق	42
● سیاسی نظام ("ہندستانی مسلمان" سے اقتباس)	محمد مجیب	44
طلبہ کے لیے		
● انگریزی میں مہارت — کورس اور ادارے (کیریئر گائیڈنس)	سلمان عابد	48
● پریزنٹیشن کی تیاری	امیت جین	50
● ہندستان کا آئین (کوئز)	معراج احمد	55
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-22)	طارق عمیر عثمانی	59
اُردو خبرنامہ	ادارہ	60
تبصرہ و تعارف	کتابوں پر تبصرے	72
● اردو مرثیے کا ارتقا/ ڈاکٹر مسیح الزماں	مبصر: احمد کفیل	
● وادیِ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں/ سر مورٹیمر وھیلر	مبصر: ظفر احمد نظامی	
● سورداس کے روحانی نغمے/ جعفر رضا زیدی	مبصر: رئیس احمد	
● انداز بیاں اور/ مرغوب حیدر عابدی	مبصر: مخمور سعیدی	
● مشتاق احمد یوسفی (ایک مطالعہ)/ مظہر احمد	مبصر: محمد نوشاد عالم	
بچوں کا گوشہ		
● ایک آدمی کا کام ("کچھ اور مختصر کہانیاں" سے اقتباس)	گرجارانی استھانا	77

آپ کی بات

■ **محمد احسن، ریجنل ڈائرکٹر (انچارج)،**
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پٹنہ

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ ملا۔ مشمولات نہایت ہی معلومات افزا ہیں۔ اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور مایہ ناز نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو قومی اردو کونسل کا وائس چیئر مین مقرر کیا جانا کونسل اور تمام اردو داں طبقے کے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ ان کی سرپرستی اور آپ کی نگرانی میں امید ہے کہ کونسل مزید کارہائے نمایاں انجام دے گی۔

آج بعض لوگ یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ اردو ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح کی سوچ سے مایوسی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ دراصل جہاں اردو کے چراغ جل رہے ہیں، اکثر کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ پاتیں اور ایسے لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر اردو کا مرثیہ پڑھنے لگتے ہیں۔ کسی زبان کی بقا اور تحفظ کا ضامن اس کا ادب ہوتا ہے اور اس زبان کا وجود اور اس کی بقا اس زبان کے لچیلے پن اور قبولِ عام پر منحصر ہے۔ وہ زبان اپنے اندر نئے زمانے کے ٹیکنالوجیکل منظرنامے اور معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کو کس حد تک اپنے اندر سمو سکتی ہے، اردو میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہ زبان نہ صرف شیریں بلکہ بہت حد تک ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور اردو کونسل نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ آپ کی سرپرستی میں کونسل نے کمپیوٹر کے تربیتی مراکز کے ذریعے اردو داں طبقے کو عصرِ حاضر کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے، انھیں ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے اور انھیں خود کفیل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس پروگرام کی کامیابی آپ کی محنت اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کے فروغ اور اسے عصری ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں آپ نے جس منصوبہ بند تحریک کا آغاز کیا ہے اس کے لیے آپ اور کونسل کے جملہ ارکان مبارک باد کے مستحق ہیں۔

[illegible]

لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ دی جائے۔ اردو کی ترقی اور ترویج کا انحصار اردو پڑھنے والے طالب علموں پر ہے اور اس کے لیے ابتدائی سطح پر اردو کی تعلیم کا پختہ انتظام اور طالب علموں کی تعداد بڑھانا ضروری ہے۔ ورنہ تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ لہٰذا اردو علاقوں کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی میڈیم کے ان پبلک اسکولوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جہاں اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایسے اسکولوں کی انتظامیہ پر زور دینے کی ضرورت ہے اگر ضرورت محسوس کی جائے تو کونسل کی طرف سے مالی معاونت بھی کی جائے۔ ایسے اسکولوں کے بچوں کے لیے حوصلہ افزائی کے انعام اور اسکالرشپ دینے کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔

کونسل کا ایک اہم کام اردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت بھی ہے۔ یہ غالباً اردو زبان میں دنیا کا پہلا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اگر Visuals کے ساتھ اس کی سی ڈی بن جائے تو یہ بھی کونسل کا ایک اہم کارنامہ ہوگا پھر یہ تمام CDs کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں پر بھی مہیا کرائی جاسکتی ہیں۔ تاکہ طلبہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

■ **شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، زیب منزل،**
مشیر آباد، حیدرآباد

''اردو دنیا'' ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ مارچ 2005 کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ عالی جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنی وائس چیئرمین شپ میں واقعی کونسل کے نام اور کام کو خوب سے خوب تر بنائیں گے۔ چونکہ موصوف ماضی میں ترقی اردو بیورو سے منسلک رہے ہیں۔ آپ کا ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ سے سرفراز ہونا بھی بے حد خوش

کن خبر ہے۔ آپ نے اردو تعلیم کو جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔

زیرِ نظر شمارے کے بھی مضامین اچھے ہیں۔ گوشۂ ادب میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر پر ہری چند اختر کے مضمون نے بے حد متاثر کیا۔ تنویر احمد علوی سے اظہار احمد ندیم کی گفتگو بھی کارآمد ہے۔ مدن لال کپور کا مضمون "پہلو نزدوا۔ شاعری کا پکاسو" بھی خوب ہے۔ "اردو دنیا" واقعی اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

■ **اے۔ کے۔ ہنگل، 3، سرسوتی مینشن، فورتھ روڈ، سانتا کروز (ایسٹ)، ممبئی**

"اردو دنیا" کے اپریل کے شمارے میں میرا انٹرویو شائع ہوا ہے اس گفتگو میں مجھ سے شاید کچھ غلط بیانی ہوگئی ہے۔ برائے کرم اس کی تصحیح کر دیں۔

1. ہارمونیکا کلب میں نے کراچی میں بنائی تھی، پشاور میں نہیں۔
2. میں نے 14 اگست کو کراچی ریڈیو سے ڈرامہ "بکس" پیش کیا تھا، 16 اگست کو نہیں۔
3. مشہور گویئے خاں صاحب عاشق علی خاں جن کے ساتھ میں نے ایک دن ہارمونیم پر سنگت کی تھی، وہ بیگم اختر کے استاد تھے، والد نہیں۔
4. میں علامہ مشرقی کی بلیچہ پارٹی میں شامل ہوگیا یہ غلط ہے۔ وہ میرے ہیڈ ماسٹر ضرور تھے لیکن میں ان کی سیاست سے بالکل اتفاق نہیں کرتا تھا اور نہ ہی میں کبھی ان کی بلیچہ پارٹی میں شامل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو سرحدی گاندھی کا چیلا تھا اور ان کی عدم تشدد کی پالیسی کا پیروکار۔

■ **محمد علی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ڈپارٹمنٹ آف فوڈ اینڈ سپلائی، گورنمنٹ آف ویسٹ بنگال**

"اردو دنیا" کا فروری کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ نوشاد مومن کا مقالہ کافی معلوماتی ہے۔ سلیمان اطہر جاوید کے رپورتاژ کے مطالعے سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ دریدا کے حوالے سے لکھے گئے دو مضامین "افکار دریدا" اور "جگس دریدا" قابلِ توجہ ہیں۔ فضیل احمد خاں نے ڈیکنز راؤنے کے مضمون کا ترجمہ کیا ہے لیکن دریدا کو سمجھنے میں ان سے کہیں کہیں سہو ہوا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ اقتباس کا خالق ہی اقتباس کے معنی کا مصدر اور مرجع ہے، صحیح نہیں ہے کیوں کہ تفہیمِ معنی میں ہر طرح کی مرکزیت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ ردِ تشکیل کی تعریف نہیں کرتا کیوں کہ ایسا کرنا خود اس کے نظریے کے منافی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ معنی ہمیشہ التوا میں رہتا ہے۔ معنی کسی دائمی صورت کا نام نہیں۔ معنی متن میں نہ حاضر رہتا ہے اور نہ غائب اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ متن میں معنی حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔ غیر حاضر نشانات جو حاضر نشانات کے ہمراہ نہیں ہوتے ہیں معنی یابی کا سبب بنتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے معنی کی مثال کلی کی چٹک سے دی ہے۔ جب پنکھڑیاں کھلتی ہیں تو خوشبوئے لطیف فضا میں بکھر جاتی ہے اور پھول ڈالی سے لگا ہی رہتا ہے۔ معنی اور متن کی جدائی اور رشتے داری اسی انداز کی ہوتی ہے۔ دریدا اس نظریے کا پہلا مفکر نہیں ہے۔ مشہور سنسکرت عالم پانی کو کبھی وہی حیثیت حاصل تھی جو آج دریدا کو ہے۔

■ **شاد محمد راہی، سکریٹری بزم اردو، یتیم خانہ، جودھپور، راجستھان**

"عالمی سہارا" میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کو ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اردو زبان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے موجودہ عہد کی برقی رفتار سے ہمکنار کرانے کے لیے قومی اردو کونسل کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ صحیح معنوں میں آپ اس اعزاز کے حقدار ہیں۔

■ **[illegible]**

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ کے لیے منتخب ہونے پر میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ اپنی تمام رحمتوں سے آپ کو نوازے۔

■ **[illegible]، پوسٹ بکس 8807، دہلی-84**

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ پانے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **ابرار اعظمی، پوسٹ گریجویٹ کالج، مالٹاری، اعظم گڑھ**

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ خبر نہایت مسرت افزا، اطمینان بخش اور خوش آئند ہے۔ آپ نے جس والہانہ انداز سے ان کا خیر مقدم کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے، فاروقی صاحب اس کے مستحق ہیں۔ دراصل بڑے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اولاً وہ جو کسی منصب کی وجہ سے بڑے ہوجاتے ہیں اور دوئم وہ جن کی وجہ سے منصب کی توقیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب کا تعلق آخر الذکر سے ہے۔

■ **بشیر احمد، صدر نشین انجمن فروغِ زبان و تعلیم اور اڈیٹر "عصری آگہی"، اے-78، جی-3، دلشاد کالونی، دہلی-110095**

بھارت میں اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے مسائل کے عنوان سے بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں مگر اصل کام جس کی ضرورت ہے اس کی طرف کم توجہ دی جارہی ہے۔ یعنی اردو پرائمری اسکولوں کا قیام۔ پرائمری اسکول قائم کرنا میونسپلٹی کا کام ہے۔ اگر کوئی میونسپلٹی ایسا نہیں کرتی تو اس کے خلاف قانونی کارروائی ہوسکتی ہے۔

مسلمان بچوں کے لیے فی الحال زیادہ سے زیادہ پرائمری اسکولوں کی ضرورت ہے اور انھیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا جاسکے تو یہ بڑی بات ہوگی۔ اس سلسلے میں اگر علمائے اسلام تعلیم کی اہمیت اور خاص طور پر ابتدائی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر اپنے خطبوں میں زور دیں تو شاید مسلمان اس طرف آمادہ ہوں۔ دہلی میں مسلم طلبہ کے لیے وظیفے کا بھی انتظام ہے۔ اگر مسلمانوں کی تنظیمیں

اس طرف متوجہ ہوں تو مسلم طلبہ کی مالی مدد بھی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو اگر عہد حاضر میں عزت و وقار سے جینا ہے تو انھیں ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ دینی ہوگی۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف مذہبی تعلیم ہی اصل تعلیم ہے اور اسی پر اسلام نے زور دیا ہے حالانکہ تعلیم سے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم مراد ہے۔ ہمیں دین اور دنیا دونوں کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اس لیے تمام حضرات سے میری درخواست ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کریں۔ اگر کسی طرح کے تعاون کی ضرورت ہو تو ہم سے رجوع کریں۔

■ **رضوان خاں، شیخ سرائے، سیتاپور**

''اردو دنیا'' ماہ بہ ماہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اس رسالے کو اردو دنیا میں جو مرکزیت حاصل ہے اس سے شاید ہی کوئی انکار کرے۔ ساتھ ہی ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' بھی ''مرکزِ اردو'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے جس خلوص سے اردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہے اس سے مسائل میں کمی آئی ہے اور وسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ فروری کے شمارے میں جناب جی. ڈی. چندن کا مضمون ''اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں'' اہمیت کا حامل ہے۔ پانچویں کل ہند اردو کتاب میلے کی رپورٹ اچھی لگی۔ اس کے علاوہ ''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' سے اقتباس بھی پسند آیا۔ تبصرہ و تعارف کے کالم کے تحت جناب رمیندر جاکھو ساحل کے مجموعۂ کلام پر مخمور سعیدی صاحب کا تبصرہ بھی پسند آیا۔

■ **شاہنواز اختر، کریم چک، چھپرہ (بہار)**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ خوبصورت سرِ ورق، بہترین کاغذ اور قابلِ مطالعہ تخلیقات، کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ زبان و ادب کے فروغ کے علاوہ، اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو جدید تعلیمی و تکنیکی معلومات سے روشناس کرانے کی آپ نے جو پہل کی ہے، وہ اپنے آپ میں بے نظیر ہے۔ اردو کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے تاریخ کے صفحات میں آپ کی یہ کاوشیں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔

■ **پی. احمد باشا، ڈپارٹمنٹ آف اردو، جمال محمد کالج ترچراپلی**

''اردو دنیا'' ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ صوری اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ عام ادبی رسائل سے یہ اس لیے بھی مختلف ہے کہ اس میں تکنیکی سطح پر تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور روزگار کے متلاشی نوجوانوں کے لیے کافی مواد ملتا ہے جو عام رسائل میں یا تو ہوتا ہی نہیں ہے یا پھر بہت کم ہوتا ہے۔ تملناڈو کے ترو چی جیسے دور دراز علاقے میں، (جو کبھی اردو کا مرکز ہوا کرتا تھا) اردو زبان کے احیا اور اردو کمپیوٹر سینٹر کھول کر آپ نے جو کام کیا ہے وہ لائقِ صد تحسین ہے۔

■ **فرید پرتی، 66، گورنمنٹ ہاؤسنگ کالونی، راولپورہ سری نگر، کشمیر**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ مشمولات معیاری اور معلومات افزا ہیں۔ یہ رسالہ اردو زبان سے تعلق خاطر رکھنے والوں کو ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی رشتے میں پرو رہا ہے۔ یہ اس موقر رسالے کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مذکورہ شمارے میں دریدا پر مضامین پسند آئے۔ یہ نئی تنقیدی فکر اور بصیرت فراہم کرنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔

■ **احمد کرم، بی-195، آواس وکاس، جھانسی-3**

دسمبر 2004 کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ مدن گوپال صاحب نے اپنے مضمون ''ہندستان کی قومی زبان اور پریم چند'' میں جو معلومات فراہم کی ہیں اس کے لیے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔ مضمون کے آخر میں موصوف نے لکھا ہے کہ 1962 میں یومِ اقبال کے موقعے پر بابائے اردو نے کراچی میں بیان دیا.....

میں معذرت کے ساتھ اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 1961 میں اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ لہٰذا 1962 کا اندراج غلط ہے۔

■ **ابن غوری، گلشن باغ روڈ، حیدرآباد-64**

ایک تھے حیدرآباد کے مرحوم ڈاکٹر حمید اللہ جنھوں نے ملکوں ملکوں اسلام کی اشاعت کی اور ایک ہیں کشمیر کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ جو شہروں شہروں اردو کی اشاعت کر رہے ہیں۔ وہ سفیرِ اسلام تھے تو یہ سفیرِ اردو ہیں۔

■ **تسیم فاطمہ، ایم. کے. انور اینڈ کمپنی، 20 چاندنی چوک اسٹریٹ، کولکاتہ**

میں ''اردو دنیا'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتی ہوں۔ اردو ادب کے ساتھ سائنسی ترقی اور کمپیوٹر سے متعلق مواد نے اس ماہنامے کے دامن کو وسیع کر دیا ہے۔

موجودہ دور میں اردو کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل جو کام کر رہی ہے، اتنا کام کسی اور ادارے نے نہیں کیا ہے۔

■ **شہناز عالم ملک پوری، اردو ڈپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف الٰہ آباد**

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ جنوری کے شمارے میں جناب مخمور سعیدی اور مظہر امام صاحب نے نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کلیم عاجز کا انٹرویو، اداریہ، گیسٹ کالم، کوئز بے حد معلوماتی ہیں۔ عابد سہیل نے ''نہر پر چل رہی ہے پن چکی'' کے عنوان سے عشرت علی صدیقی پر اچھا مضمون لکھا ہے۔

■ **احمد پرکاش، ایم آئی جی، 304، ریشم اپارٹمنٹ نزد بھارت ٹاکیز، بھوپال**

''اردو دنیا'' پوری طرح ایک معیاری رسالہ بن گیا ہے۔ یہ رسالہ اردو والوں کے دل میں ایک جگہ بنا چکا ہے۔ تمام مضامین لائق صد تحسین و آفریں ہیں۔ اردو خبر نامہ اور بچوں کا گوشہ بہت مفید ہیں۔

□□□

ہماری بات

موجودہ دور میں بورڈ اور میڈیکل و انجینئرنگ کے داخلہ امتحانات ہمارے ملک میں بچوں کی فطری ترقی اور آزادانہ سوچ میں بھاری رکاوٹ بن رہے ہیں۔ امتحانات کا مقصد صلاحیت کی جانچ اور کیریئر کے انتخاب میں مدد کرنا ہے لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہو پا رہا ہے۔ جب بھی امتحانات قریب آتے ہیں، ملک کے 1.34 لاکھ ہائر سیکنڈری اسکولوں کے 30 ملین اعلا ثانوی درجات کے طلبہ اجتماعی طور پر شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین بھی فکر و تردد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر امتحانات کے ڈر سے بچے خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں تو ہمیں غور کرنا ہوگا کہ کہیں نہ کہیں ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی بڑی کمی ضرور ہے۔ شدید مسابقت اور ہائی کٹ آف فیصد کے دباؤ میں بچے کوچنگ سینٹروں کی پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور بورڈ امتحان کی تیاری کے لیے سال بھر میں چھ یا سات جانچ امتحانات دیتے ہیں۔ اس طرح ہماری نوجوان نسل میں خود اعتمادی اور تخلیقی ذہن پیدا ہونے کی بجائے یہ تصور ابھرا ہے کہ ان کے مستقبل کا تمام تر انحصار امتحانات کے اچھے نتائج پر ہے۔

بورڈ امتحان کی وجہ سے طلبہ پر اس قدر دباؤ کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسکول میں 13 سال میں سیکھی ہوئی چیزوں کی جانچ صرف ایک امتحان میں کرنے کی کوشش ہوتی ہے جس سے بچوں کی پوری زندگی کا رخ متعین ہوتا ہے۔ اسے زندگی اور موت کا سوال بنا دیا گیا ہے۔ ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں صرف غیر معمولی طلبہ پر ہی توجہ دی جاتی ہے، اوسط قسم کے طالب علموں کے لیے ان میں کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ بعض کالجوں میں تو 90 فیصد سے کم نمبر والے کا داخلہ ہی نہیں ہوتا۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ امتحان کے خوف کی وجہ سے بہت سارے بچے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں میں طالب علموں پر 50 فیصد دباؤ بڑھ گیا ہے۔ یہ ایک بہت اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ پڑھائی کے ڈر سے جہاں بچے گھر سے بھاگ جائیں، لڑکیاں زنا بالجبر کی جھوٹی رپورٹ دیں اور ان تمام پریشانیوں سے تنگ آکر اپنی جان دے کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یہ لمحۂ فکریہ ہے اور اگر اب بھی اس کے تدارک کی کوشش نہیں کی گئی تو ملک اور قوم کو سنگین نتائج بھگتنے پڑ سکتے ہیں۔

اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے کئی سطحوں پر کام کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو والدین کو اپنے بچوں پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ ان کے بچے کسی پریشانی یا دباؤ کا شکار تو نہیں ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر ان سے ہمدردانہ اور شفقت آمیز لہجے میں بات چیت کر کے ان کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اساتذہ کی بھی اس ضمن میں اہم ذمے داری ہے۔ عام طور پر زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ پر اساتذہ زیادہ توجہ دیتے ہیں اور کم نمبر حاصل کرنے والے یا فیل ہو جانے والے بچوں کو حقارت اور توہین آمیز نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف بچوں میں احساس کمتری پیدا کرتا ہے بلکہ بعض اوقات انھیں اپنے آپ کو ناکارہ اور خاندان پر بوجھ تصور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اساتذہ کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا اور تمام بچوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا ہوگا اور بچوں سے گفتگو کر کے ان کی دقتوں اور مسائل کو حل کرنے میں ان کی مدد کرنی ہوگی تبھی ہم تعلیم کے بنیادی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکیں گے۔

یہ اچھی بات ہے کہ ان مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں پر کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے ایک سرکلر جاری کر کے نوکر شاہوں کی توجہ داخلہ امتحانات خصوصاً ملک کے آئی آئی ٹی اور انجینئرنگ کالجوں میں داخلے کے لیے ہیبتناک دباؤ پر مرکوز کرائی ہے۔ انھوں نے نظام امتحان میں اصلاحات کرنے اور اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے گذشتہ دنوں ایک میٹنگ بھی بلائی تھی۔ وزارت کے اعلا عہدے داران اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہیں کہ ایک ایسا طریقہ تلاش کیا جائے جس میں طلبہ کی صلاحیت کی عمدہ جانچ ہو اور بہتر نتائج سامنے آسکیں۔

سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری اسکول ایگزامینیشن یہ منصوبہ بنا رہا ہے کہ بورڈ امتحان میں 50 فیصد سوالات معروضی نوعیت کے ہوں جن کے چار متوقع جوابات دیے گئے ہوں، بقیہ 50 فیصد سوالات صلاحیت اور واقفیت کی جانچ کے لیے ہوں۔ آٹھویں درجے کی بجائے دسویں تک گریڈنگ سسٹم لاگو کرنے پر بھی غور کیا جا رہا ہے جس میں پاس اور فیل کا کوئی چکر نہ ہو۔ این سی ای آر ٹی بھی اس ضمن میں کوشاں ہے اور درسی کتابوں کو طلبہ کے لیے آسان بنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

ممتاز ماہر تعلیم اور اسٹیئرنگ کمیٹی برائے اصلاح نصاب کے چیئرمین پروفیسر یشپال کا کہنا ہے کہ امتحان کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ یادداشت کی جانچ کرنے کی بجائے غور و فکر کی صلاحیت اور فہم و ادراک پر زور دے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آموزشی عمل کو دلچسپ بنایا جائے۔ اگر ان امور پر عمل درآمد ہو سکا تو امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمارے طلبہ کو ذہنی دباؤ سے آزاد رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل سکے گا۔

گیسٹ کالم

تحریر: ابھیشیک راجا
ترجمہ: فیاض عالم

امتحان کا خوف

☆ پاپا میں آپ لوگوں کے لائق نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کی امیدوں پر کھرا اتر سکتا ہوں۔ آپ کسی اور کو اپنا بیٹا بنا لیجیے جو آپ کی آرزوئیں پوری کر سکے۔

☆ امتحان کی تیاری نہیں ہونے کی وجہ سے فیل ہونے کا خوف بار بار ستا رہا ہے۔ ممی پاپا نے مجھ سے ڈھیر ساری امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں جنھیں میں پورا نہیں کر پاؤں گا۔

☆ پڑھائی کے معاملے میں ہمیشہ ماں باپ کی ڈانٹ پھٹکار سے پریشان ایک لڑکی نے زنا بالجبر کی جھوٹی رپورٹ تھانے میں درج کرا دی تاکہ اسے گھر والوں سے ہمدردی اور پیار مل سکے۔

☆ کولکاتہ کے ایک لڑکے نے امتحان دینے کے بجائے اپنے اغوا کا ناٹک کیا تاکہ گھر والے اس سے ناراض نہ ہوں۔ جبکہ اس کی وجہ امتحان کا خوف اور ادھوری تیاری تھی۔

یہ وہ عبارتیں ہیں جو اسکولی طالب علموں نے خودکشی سے پہلے اپنے نوٹ میں تحریر کی تھیں یا پھر امتحان میں ناکامی کی صورت میں وہ اپنے والدین کی ناراضگی سے اس قدر ڈر گئے تھے کہ انھوں نے فرضی کہانیوں کا سہارا لینا زیادہ مناسب سمجھا۔

ان واقعات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں طالب علموں کے لیے امتحان ایک ہوّا بن گیا ہے۔ بہت سے طلبہ اسے زندگی اور موت کا سوال مان لیتے ہیں اور ناکام ہونے پر جان تک دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ حال ہی میں دہلی اور ملک کے کئی شہروں میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ دہلی میں تو ایک خاتون نے اپنی بیٹی کا پرچہ خراب ہونے پر اپنی جان دے دی۔ امتحان کی تاریخ نزدیک آتے ہی اکثر طالب علموں میں تناؤ بڑھنے لگتا ہے اور نتیجہ آنے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

کیا واقعی پڑھائی یا امتحان ہی کی وجہ سے ہمارے ملک کے طلبہ تناؤ میں جیتے ہیں؟ یا پھر میٹروپولیٹن اور بڑے شہروں میں ہی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جہاں لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے دباؤ کی وجہ سے طالب علموں میں زندگی اور کیریر کے تئیں غیر یقینی کا ماحول رہتا ہے؟ یا پھر ہمارا تعلیمی نظام ایک آگ کا دریا ہے جسے پار کرنے والے کامیاب اور کنارے رہ جانے والے کسی لائق نہیں سمجھے جاتے۔ ایسے کئی سوال ہیں جن کا جواب تلاش کرنا سماجی، سیاسی اور سرکاری سطح پر لازمی ہے۔

ہندستان میں ہر سال ہزاروں لوگ خودکشی کرتے ہیں جس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ 1998 سے تو یہ اعداد و شمار لاکھ کے اوپر پہنچ گئے ہیں۔ نیشنل کرائم رکارڈ بیورو جو مرکزی وزارت داخلہ کے ماتحت کام کرتا ہے کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو یہ کافی چونکانے والا ہے۔ خاص طور سے طالب علموں اور نوجوانوں کے معاملے میں اس کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پڑھائی کو لے کر طالب علموں پر کتنا دباؤ ہوتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ہندستان میں ہر پانچ منٹ پر ایک آدمی خودکشی کرتا ہے۔ خودکشی کرنے والے تین لوگوں میں سے ایک 15-29 سال کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس ایج گروپ میں طالب علموں کی تعداد ہی زیادہ ہوتی ہے اور اس ایج گروپ کا تناسب خودکشی کرنے والوں میں 33 سے 36 فیصد ہے۔ مزید برآں خودکشی کرنے والے 74 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔

گذشتہ ایک دہائی میں اس تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے اعداد و شمار سے صورت حال کی سنگینی کا پتہ چلتا ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ ایک دہائی میں ناکامی نے کتنے طالب علموں کی جان لی اس کا اندازہ صرف ایک سال کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ 2001 میں 15-29 سال ایج گروپ کے تقریباً 38 ہزار لوگوں نے خودکشی کی، ان میں 5474 طلبہ تھے۔ ان میں سے 2062 طلبہ نے امتحان میں ناکامیاب ہونے پر خودکشی کی تھی۔ اسی سال 14 سال تک کے 3007 بچوں نے خودکشی کی۔ ان میں بھی سب سے زیادہ تعداد 387 امتحان میں ناکامیاب ہونے والے بچوں کی تھی۔

● امتحان کا خوف ہمارے تعلیمی نظام کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ناکام طلبہ کی خود کشی کی کئی معاملے سامنے آئے ہیں۔ شاید ہماری تعلیم وہ سبق نہیں دے پا رہی ہے جو آج کے مسابقتی دور میں ضروری ہے۔ یہ تعلیم یا نظام امتحان کیوں طالب علموں کے لیے تناؤ کا سبب بن گیا ہے؟ اس مضمون میں انہی پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے

ریاستی سطح پر اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو پہلے پانچ صوبوں میں مغربی بنگال سرفہرست ہے۔ 2001 میں وہاں 814 طالب علموں نے امتحان میں فیل ہونے پر خودکشی کی۔ ان میں 397 طلبہ اور 417 طالبات تھیں۔ مہاراشٹر میں 789، کرناٹک میں 512، آندھرا پردیش میں 470 اور تامل ناڈو میں 404 طالب علموں نے امتحان میں ناکام ہونے پر اپنی جان دی۔ ملک کے چار میٹرو پولیٹن شہروں کی بات کریں تو ممبئی اس معاملے میں پہلے نمبر پر ہے جہاں 125 طالب علموں نے امتحان کی ناکامیابی سے گھبرا کر موت کو گلے لگایا۔ دوسرے مقام پر ملک کی راجدھانی دہلی (104) اور تیسرے نمبر پر چنئی (52) رہا جہاں سب سے کم طلبہ نے خودکشی کی۔ جہاں تک کولکاتہ کی بات ہے تو وہاں کے اعداد و شمار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ خودکشی کا رجحان صرف میٹرو پولیٹن اور بڑے شہروں تک محدود نہیں ہے۔ ریاست کے اعداد و شمار میں جہاں مغربی بنگال کا پہلا مقام تھا اس کے حساب سے کولکاتہ میں ناکامی کی وجہ سے صرف چار اموات ہوئیں۔ یہی نہیں مغربی بنگال کا کوئی بھی بڑا شہر (آسنسول کو چھوڑ کر جہاں ایک طالب علم نے خودکشی کی) اس کیٹگری میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ بنگلور اور ناگپور دو ایسے شہر ہیں جہاں 2001 میں سب سے زیادہ طلبہ نے خودکشی کی۔ ان دونوں شہروں میں یہ تعداد بالترتیب 119 اور 47 تھی۔ 1999 اور 2000 میں ملک میں امتحان میں ناکامیابی کی وجہ سے بالترتیب 2279 اور 2320 طلبہ نے جان دی۔ دہلی پولیس کے اعداد و شمار کے مطابق 2002 میں 14 سال تک کے 11 طلبہ نے اور 15-29 سال کے 24 طلبہ نے خودکشی کی۔ جب کہ 2003 میں 14 سال تک کے 8 اور 15-29 سال کے 28 طلبہ نے ناکامیابی کے سبب موت کا راستہ اختیار کیا۔ یہ اعداد و شمار تو پولیس ریکارڈ میں درج معاملوں کی بنیاد پر بتائے گئے ہیں۔ جبکہ واقعتاً یہ تعداد اس سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں طالب علم ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے ناکامیابی کی صورت میں موت کا راستہ چنا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ ان کا ریکارڈ درج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے جن کے ذہن میں اکثر خودکشی کا خیال آتا رہتا ہے۔

طالب علموں میں خودکشی کے بڑھتے رجحان کے بارے میں ماہرینِ نفسیات کی الگ الگ رائے ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کی پروفیسر ارونا بروٹا اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری اقدار میں آنے والی گراوٹ قرار دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لبرلائزیشن کے ساتھ ساتھ سماج میں دکھاوے کا چلن اور اوچھاپن بڑھتا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کے آدرش (رول ماڈلس) بدلتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ والدین کی سوچ میں بھی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ بچوں کو سب سے پہلے ماں باپ اور کنبہ خاندان سے ہی تعلیم و تربیت ملتی ہے۔ وہ اپنے گھر اور پاس پڑوس میں جو کچھ دیکھتے ہیں اسی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ماں باپ ماڈرن ہونے کا دعوا تو کرتے ہیں مگر بچوں کی زندگی کی ڈور ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچوں پر غیر ضروری بندشیں عائد کرتے ہیں اور انھیں کھلی فضا میں آزادانہ طور پر جینے سے روکتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ انھی کی ہدایات پر چلے' خاص طور سے کیریئر اور پڑھائی کے معاملے میں تو یہ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ والدین اپنی خواہشوں کی تکمیل اپنے بچوں کے ذریعے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ بھلے ہی انھوں نے اپنے ماں باپ کی آرزوئیں پوری نہ کی ہوں۔ اس کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں کم عمر میں ہی بچوں کے پاس معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ معلومات کے معاملے میں وہ اپنی عمر سے پہلے ہی بڑے ہو جاتے ہیں مگر اس کا صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر پاتے جو ذہن کی پختگی سے ہی آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی اقدار سے تال میل نہیں بٹھا پاتے ہیں۔

اس کے متعلق سینئر ماہرِ نفسیات ڈاکٹر آر. ی. جلوہا کا کہنا ہے کہ طالب علموں میں خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی کئی وجوہات ہیں۔ ڈاکٹر جلوہا کے مطابق زیادہ امیدوں کی وجہ سے بچوں پر والدین کا دباؤ تو ہوتا ہی ہے ساتھ میں سماجی دباؤ بھی ہوتا ہے۔ موجودہ عہد میں ہمارے سماج کا تانا بانا کچھ اس طرح بُن دیا گیا ہے کہ اس میں کامیاب آدمی کی جہاں ہر طرف تعریف و تحسین ہوتی ہے وہیں ناکامیاب ہونے یا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کوئی کامیابی یا ناکامیابی کا پس منظر جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ 'جو جیتا وہی سکندر' کی کہاوت یہاں پوری طرح صادق آتی ہے۔ ماں باپ چاہتے ہیں کہ ہمارے آدھے ادھورے کام ہمارے بچے پورا کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستوں کے گروپ کا دباؤ بھی ہوتا ہے۔ اگر اس کے ہم جماعت یا ساتھ کھیلنے والے بچوں میں سے کسی نے بہت اچھی کامیابی حاصل کر لی ہو تو وہ بھی ویسے ہی نتیجے پانے کی ہوڑ میں لگ جاتا ہے اور اگر ایسا نہیں کر پاتا تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناکارہ ہے۔

دہلی کے ودیا ساگر انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ اینڈ نیورو سرجری (وِمہنس) اسپتال کے سینئر نفسیاتی معالج ڈاکٹر جیتندر ناگپال کی رائے اس کے بارے میں ذرا مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے بچے خوابوں اور

امیدوں میں جیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسابقتی امتحانات کی سطح بھی کافی اونچی ہوگئی ہے۔ اس سے بچوں کی نفسیات متاثر ہوتی ہے۔ خودکشی کرنے والوں میں زیادہ تر بچے ایسے ہوتے ہیں جنھیں سماجی تحفظ نہیں ملتا یا وہ اس کے تئیں مشکوک رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جنھیں ماں باپ، اساتذہ اور دوستوں کے تحفظ کا محدود دائرہ حاصل ہوتا ہے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے انھوں نے ناامید، مایوس اور ناکارہ کا فارمولا بنایا۔ ایسے بچے جنھیں کہیں سے بھی امید نظر نہیں آتی اور جنھیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہے، وہ آخر میں خود کو ناکارہ سمجھ کر خودکشی جیسا خطرناک قدم اٹھا لیتے ہیں۔

در اصل بڑھتی مسابقت کے اس دور میں ہر فرد پڑھائی کے ذریعے ہی کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ اس میں ناکام رہنے پر یا خاطر خواہ نتیجہ نہ ملنے پر وہ تناؤ میں جیتے ہیں۔ بار بار ناکامیاب ہونے پر وہ گھبرا جاتے ہیں اور انھیں اپنی زندگی بارگراں محسوس ہونے لگتی ہے۔ سماجی حیثیت کے چکر میں جب والدین دوسروں سے اپنا موازنہ نہیں کر پاتے تو ان میں فطری طور پر تناؤ بڑھنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ بچوں کو خاطر خواہ وقت نہیں دے پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے بڑھتے تناؤ پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی۔ ان حالات میں بچوں کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور اسکول میں بھی ان پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر بچے نے نویں جماعت میں اچھی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا تو اسے دسویں جماعت میں داخلہ نہیں ملتا۔ اسکول والے اوسط بچوں پر توجہ نہ دے کر ان کی توہین کرتے ہیں اور انھیں ڈرانے دھمکانے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان حالات سے نپٹنے کے لیے نفسیاتی معالجوں اور ماہرین تعلیم کا مشورہ یہ ہے کہ بچے پڑھائی کے تئیں اپنے رویے میں تبدیلی لائیں اور امتحان کے دو تین مہینے پہلے تیاری شروع کرنے کی بجائے مسلسل پورے سال توجہ سے پڑھائی کریں۔ لیٹ کر پڑھنے کی بجائے کرسی ٹیبل کا استعمال کریں۔ ساتھ ہی ساتھ لکھ کر پڑھنے سے ذہن ایک جگہ مرکوز رہتا ہے۔ پڑھائی کی وجہ سے اگر بچے تناؤ کا شکار ہیں تو انھیں اپنے والدین کے ساتھ دوستوں، صلاح کاروں اور نفسیاتی معالجوں سے ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ اس سے جہاں ایک طرف وہ اپنی پریشانیوں کا اظہار کر پاتے ہیں وہیں مناسب مشورے سے ان کی خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر اچھا نتیجہ نہیں آتا تو گھبرانے کی بجائے صبر و تحمل سے کام لیں اور آئندہ کے لیے خود کو تیار کریں۔ ایسی حالت میں والدین کو انھیں سخت سست کہنے اور ڈانٹنے پھٹکارنے کی بجائے ان کی ناکامیوں کے اسباب کا پتہ لگا کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

ناکامیوں سے پریشان ان بچوں کے ان مسائل کے حل کے لیے سرکاری اور نجی سطح پر کوشش جاری ہے۔ ومہنس کی طرف سے بچوں کی ترقی اور ان کے مسائل سے متعلق مینٹل ہیلتھ پروگرام اسکولی سطح پر چلائے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر جیتندر ناگپال اس کے کنوینر ہیں۔ اس کے تحت بچوں کو اچھی زندگی گزارنے، گھر اور اسکول کے درمیان اچھے تعلقات بنانے، تعلیم اور مینٹل ہیلتھ کے تئیں بیداری، کیریر سے متعلق نظریہ، پڑھائی کے مسائل سے نمٹنے، ان کی کونسلنگ (مشاورت) وغیرہ کئی پروگرام شامل کیے گئے ہیں۔ اس پروگرام میں نہ صرف بچوں بلکہ والدین اور اساتذہ کو بھی شامل کیا گیا ہے اور انھیں تناؤ سے بچانے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ناگپال کا کہنا ہے کہ خواہ کوئی بھی صورت حال ہو، ماں باپ اور اساتذہ کی بچوں سے گفتگو جاری رہنی چاہیے۔ بات چیت سے مسائل کا حل آسانی سے نکل سکتا ہے۔ والدین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں جینے کی بجائے حقیقت سے آنکھیں چار کرنا سیکھیں۔ وہ تناؤ سے جتنا دور بھاگیں گے، یہ ان کا اتنا ہی پیچھا کرے گا۔ اس لیے تناؤ کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس سے فرار اختیار کرنے کی۔ ڈاکٹر ناگپال کے ساتھ کام کرنے والی بچوں کی ماہر نفسیات دویا پرساد تو یہ مشورہ دیتی ہیں کہ اسکولوں کو ایک پروگرام بنا کر یہ انتظام کرنا چاہیے کہ بچوں کو ہر موضوع کے ماہر اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بچوں کو یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ انھوں نے اپنا مقصد کیسے حاصل کیا اور اس میں انھیں کیا کیا دقتیں آئیں۔ اس کے ساتھ بچے اپنے دوستوں کے والدین کے ساتھ گھل مل کر ایک نیا ماحول بنا سکیں گے۔ عملی طور پر کیریئر کونسلنگ بچوں، والدین اور اسکول سب کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ حالانکہ ماہرین کا خیال ہے کہ مسائل پیدا ہونے کے بعد ان کا حل تلاش کرنے سے بہتر یہ ہے کہ انھیں پیدا ہی نہ ہونے دیا جائے۔ اچھی تعلیم دینے سے یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اہمیت اور افادیت قائم رکھنے کے لیے این. سی. ای. آر. ٹی. کی طرف سے نصاب میں تبدیلی اور نئے سرے سے غور کرنے کے لیے ایک کمیشن بنایا گیا ہے۔ جس نے 21 نکات منتخب کیے ہیں ان پر عمل درآمد کے ذریعے امید ہے کہ مستقبل میں ملک کے تعلیمی نظام کو ایک بہتر شکل ملے گی۔

(بشکریہ "جن ستا" نئی دہلی، 3 اپریل 2005)

□□□

سیدہ جعفر

دکنی لغت

لغت کسی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کا ایک مستند وسیلہ ہے۔ اس کے ذریعے زبان کے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام، انداز تکلم اور لفظوں کی قواعدی حیثیت اور اس کے لسانی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ لغت نویسی لفظوں کے معانی کی نشان دہی اور اس کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ کسی زبان کی لغت کا تعلق اس کے کسی مخصوص دور یا مختلف ادوار سے ہوسکتا ہے۔ زبان ایک نامیاتی، حرکی اور نت نئے سانچوں میں ڈھلتی ہوئی حقیقت کا نام ہے۔ تہذیبی تناظر، لسانی پس منظر اور بدلتی ہوئی مادی اقدار لفظ کو نئے معانی سے ہمکنار کرتی اور قدیم معنی کو نئی وسعتوں سے آشنا کرکے اسے پہلودار اور جامع بنا دیتی ہیں۔ لفظ، زبان میں بے سروسامانی کی حالت میں داخل نہیں ہوتا، اس کے جلو میں مفاہیم کا سرمایہ موجود ہوتا ہے۔ اس سرمائے کا جائزہ لینا بھی لغت نویسی کا جزو ہوتا ہے۔

اردو کے قدیم ادب کی اہمیت گزشتہ چار پانچ دہائیوں میں بخوبی اجاگر ہوچکی ہے اور یہ احساس عام ہو چکا ہے کہ زبان و ادب اپنی جڑوں سے غذا حاصل کرکے اور اپنی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں۔ قدیم ادب کسی زبان کی تاریخ کا اتنا ہی اہم اور ناگزیر حصہ ہوتا ہے جتنا کہ عصری اور جدید ادب۔ آج کا جدید ادب مرور زمانہ کی وجہ سے کچھ عرصے بعد قدیم بن جائے گا۔ گذشتہ چند برسوں میں متعدد نایاب مخطوطات کی بازیافت نے دکنی ادب کے سرمائے میں قابل لحاظ اور گرانقدر اضافہ کیا ہے اور شعروادب کا وہ ذخیرہ منظر عام پر آچکا ہے جس سے ہم ناآشنا تھے۔ ہمارے ملک کی بہت سی دانشگاہوں میں دکنی ادب شامل نصاب ہے۔ طلبہ، اساتذہ، محققین اور ادب کے عام قاری کے لیے دکنی لغت کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دکنی ادب کی تفہیم محض اس کی قدامت کی وجہ سے دشوار نہیں بلکہ اس کے مطالب تک رسائی حاصل کرنا اس لیے بھی مشکل ہوگیا ہے کہ اس میں سنسکرت کے تت سم اور تدبھو الفاظ اور مراٹھی، گجراتی، برج بھاشا اور پنجابی وغیرہ کے متعدد لفظوں نے جگہ پائی ہے۔ دراوڑی زبان تلگو کے بعض الفاظ نے بھی اس میں اپنا مقام اپنا لیا ہے لیکن ان کی تعداد آریائی اصل سے تعلق رکھنے والی زبانوں کی لغات سے نسبتاً کم ہے۔ دکنی ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اہمیت کے احساس نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو دکنی لغت کی تدوین کی طرف متوجہ کیا اور "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"۔ یہ ایک بہت وسیع پروجیکٹ تھا اس لیے میں نے دو مددگار طلب کیے اور پروفیسر افضل الدین سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر میر محبوب حسین ریڈر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد معاون مقرر کیے گئے۔

اس لغت کی بنیاد دکنی متن پر رکھی گئی ہے، موجودہ دکنی بول چال کی زبان پر نہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ اس کے معنی اور مثالیں پیش کی گئی ہیں تاکہ لفظ کا مکمل مفہوم قاری کے ذہن نشیں ہوسکے۔ زیادہ سے زیادہ چار مثالیں پیش کی گئی ہیں اور اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان مثالوں کے وسیلے سے لفظ کے مختلف معنوی ابعاد کا احاطہ کیا جاسکے۔ لفظ کے ساتھ ہی اس زبان کی نشان دہی کر دی گئی ہے جس سے اُسے اخذ کیا گیا ہے۔ قدیم الفاظ کے معنی کا تعین آسان نہیں اس سلسلے میں قیاس آرائی لغت نویس کو گمراہ کردیتی ہے اس لیے لغت نگار کو استناد کو اپنا رہنما بنانا پڑتا ہے۔ بہت سے الفاظ نامانوس اور متروک ہوتے ہیں اور ان کی جنس (مذکر اور مونث) اور قواعدی حیثیت ہمارے ذہن میں واضح نہیں ہوتی۔ زیرِ نظر لغت میں پانچ ساڑھے پانچ سو برس قدیم الفاظ نے بھی جگہ پائی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ لفظ اپنے لسانی مرحلوں اور تاریخی سفر میں اپنے مفاہیم کو نئے زاویے اور نئے پہلو عطا کرتا رہتا ہے اور اس کی قواعدی صورت بھی تبدیلی سے آشنا ہوتی ہے۔ اسی طرح لفظ کا تلفظ بھی تغیر سے روشناس ہوتا رہتا ہے۔ جدید اور مروجہ زبان میں لفظوں کا رواج اور ان کا چلن انھیں خواص وعوام میں مقبول اور مانوس بنا دیتا ہے اور ان کے تلفظ اور مفہوم کے بارے میں ہم کسی شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتے لیکن قدیم زبان میں تلفظ، قرأت اور معنی کی تفہیم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اس لیے اس لغت میں لفظوں پر حسب ضرورت اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ ان کا صحیح تلفظ گرفت میں آسکے۔ ذیل میں چند ایسے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں جن میں زیر اور زبر کی وجہ سے معنی کا اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔

کَن = پاس

منگوں دان تج کن منج ایمان دے (فیروز بیدری۔ پرت نامہ)

کِن = کس، کون

نہ کن تولیا منجہ آتولے کے تیس (حسن شوقی۔ فتح نامہ نظام شاہ)

جَن = لوگ۔ آدمی

رودن لاگے سگلے جن (اشرف۔ نوسرہار)

جِن = جس

"جن نے جہاں ڈھونڈیا پایا کہ وہاں محیط آ بس ہے"

(عمودخوش دہاں۔مقصود محمود)

کتا = کہتا

کتا ہے رات کی اس دھات کانی

(ابن نشاطی۔ پھول بن)

کِتا = کتنا

اور آدمی کتا ہے بھی تو خاک ہے

(فائز۔رضوان شاہ و روح افزا)

اسی طرح اگر کسی لفظ کو پیش لگا دیا جائے تو وہ علاحدہ معنی دینے لگتا ہے۔ جیسے

جَلن ہار = جلنے والا

جَلن ہار سینے کوں ٹھنڈ یک ہوئے

(غواصی۔سیف الملوک و بدیع الجمال)

جُلن ہار = جھلانے والے

ملائک اُسے جم جُلن ہار ہیں۔

(وجہی۔قطب مشتری)

جَگت = دینا

جگت میں رہیا نہیں کوئی برقرار

(طبعی۔ بہرام وگل اندام)

جُگت = تدبیر۔عقلمندی۔چالاکی

پیو پیار کے جُگت کو جب رس پرس کیا ہے

(شاہی۔کلیات شاہی)

گرہ = (گڑھ کی غیر ہاکاری شکل) قلعہ

جب شہ چڑے گھوڑے اکڑیوں فتح گڑ ایسا کیے۔

(نصرتی۔علی نامہ)

(الف) گڑ نہیں تو بوسہ گڑ سار کی کیا بات نہیں

(نصرتی۔کلیات نصرتی)

(ب) اپے گلے لگنا اپے گڑ دینا

(وجہی۔سب رس)

ایسے الفاظ کو علاحدہ اندراج کی صورت میں پیش کیا گیا ہے تا کہ ان کے معنوی پہلو پوری طرح نمایاں ہوسکیں اور قاری ان کا فرق بخوبی سمجھ سکے۔

اس ''دکنی لغت'' میں لفظوں کے تلفظ کو پیش نظر رکھا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ آج سے چار پانچ صدی قبل انھیں کس لہجے میں ادا کیا جاتا تھا۔ دکنی اشعار کی قرأت میں لفظ کے صحیح تلفظ کی اہمیت مسلمہ ہے اس سے عدم واقفیت کی وجہ سے شعر کا وزن بگڑ جاتا ہے۔ اگر کسی مشدد لفظ کو غیر مشدد پڑھا جائے تو شعر ناموزوں معلوم ہوتا ہے مثلاً فیروز شاہ بہمنی (متوفی 1422) کی رباعی کے پہلے مصرعے میں لفظ ''مُکھ'' کو مشدد پڑھنا ضروری ہے۔

تجہ مُکھ چند اجوت دے سارا جیوں

(سارا وہ آئینہ جو کسی دھات کو صیقل کر کے اور جلا دے کر تیار کیا جاتا تھا)

زبان کے ابتدائی دور میں لفظوں کا اثاثہ محدود ہوتا ہے اس لیے بھی بعض وقت ایک ہی لفظ ایسے مختلف معانی کا حامل بن جاتا ہے جن میں ہمیں معنوی ارتباط کا فقدان محسوس ہوتا ہے اور لفظ مختلف اور متناقض معنی کا احاطہ کرتا ہے۔ ''دکنی لغت'' میں ایسے الفاظ کے تمام مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ ظاہر کیا گیا ہے اور مثالوں سے ان کی وضاحت کی گئی ہے مثلاً لفظ ''کھتر''

(I) (1) کھتر = جلدی۔کوں کی گئی کھتر مر (اشرف۔نوسرہار)

(2) کھتر = صبح۔صبح کھتر اٹھی ہور تج سنگاری۔(احمد گجراتی۔یوسف زلیخا)

(3) کھتر = تیغ۔ مدھر نہ کھتر ہوئے کھتر نہ مدھر

(فخر دین نظامی۔کدم راو پدم راؤ)

(4) کھتر۔خطرہ۔تس دیک جوسی یوں کہے عشاق کا ہوگا کھتر

(حسن شوقی۔غزلیات)

(II) (1) سوکا = خط سرمہ

ہر اک سوکا ہے تیرا جیوں کٹارا

(عبداللہ قطب شاہ۔کلیات عبداللہ قطب شاہ)

(2) سوکا = سوکھا

سوکا کہیں کھوڑ اگر ہے تو اچھے اور کھوڑ صندل کا

(نصرتی۔علی نامہ)

(3) جم = (یم راج) موت کا دیوتا

غضب کا پنجہ مار جم لے چلیا

(وجہی۔قطب مشتری)

جم = ہمیشہ

جم فتح و ظفر تجہ کوں وہی نام دیوے گا

(محمد قلی قطب شاہ۔کلیات محمد قلی قطب شاہ)

شعر میں تلفظ کی گرفت بحر کے ارکان اور وزن کی وجہ سے نسبتاً آسان ہوتی ہے اس لیے زیادہ تر مثالیں نظم سے مہیا کی گئی ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دکنی ادب میں نثر پاروں کی تعداد کم اور شعری اکتسابات کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لغت میں اس نکتے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نظم کے ساتھ ساتھ ممکنہ حد تک نثر سے بھی مثالیں دی جائیں تا کہ قاری کو اندازہ ہو سکے کہ ایک ہی لفظ نظم اور نثر میں کس سیاق وسباق اور کس انداز میں جگہ پاتا ہے۔

لفظ کے ساتھ قوسین میں جہاں تک ممکن تھا اس کے دکنی مترادفات بھی درج کیے گئے ہیں اور اس کے بعد جدید اور مروجہ اردو میں اس کے معنی دیے

گئے ہیں مثلاً کلکوت (کاکلوت)، کلنگڑا (کلندرا) کونل (کمل) اور لہائی (لوائی) وغیرہ۔

الفاظ کی مثالیں پیش کرتے وقت صرف وہی مصرعہ درج کیا گیا ہے جس میں وہ مخصوص لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح نثر میں وہی جملہ مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں اس لفظ کو برتا گیا ہے۔ صرف ایسی صورتوں میں پورا شعر نقل کیا گیا ہے جہاں ایک مصرعے سے لفظ کا مکمل مفہوم بخوبی واضح نہیں ہوتا مثلاً لفظ لوہ (لوہا) کی تشریح کے سلسلے میں عبدل کے ''ابراہیم نامہ'' کا صرف ایک مصرعہ ''ملے لوہ شاگرد چو طرف جان'' لکھ دیا جائے تو معنی کی مکمل وضاحت نہیں ہوتی اس لیے مصرعہ اولیٰ

سوجھہ جگت گرو ہے پرس جیوں نشاں

بھی درج کر دیا گیا ہے۔ غواصی کی مثنوی ''مینا ستونتی'' کا ایک مصرعہ

تھنا کام یو نا کروں تو چونڈا

نڈا بالوں کے جوڑے کو کہا جاتا ہے اور مندرجۂ بالا مصرعے سے اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا اس لیے مصرعہ ثانی بھی درج کیا گیا ہے جو

ستوں کی ترت اپنے سر سے منڈا

اس طرح لفظ کے مفہوم کو غیر واضح اور مبہم نہیں رہنے دیا گیا ہے۔ معنی کی پرتیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے اور قاری کے لیے مکمل تفہیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا سابقہ ایک ایسی زبان سے ہے جو پانچ چھ صدیوں کے ارتقا میں نیا رنگ روپ اختیار کر چکی ہے۔ دکنی لغت میں لفظ کے معنی اس کے ماخذ اور اس کی مثال کے ساتھ ساتھ شاعر یا مصنف کے نام کی نشان دہی بھی گئی ہے اور اسما کی جنس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً

نکھیتر (سنسکرت نکشتر) تارے۔ اسم مذکر

نی (مراٹھی) بہت زیادہ۔ نکو کر کوئی بولنے کا ہوس

(وجہی۔ قطب مشتری)

بعض لفظوں میں ابتدائی صفحات میں تصانیف اور شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کی فہرست دی جاتی ہے اور لفظ کے ساتھ صرف اس کے مخففات درج کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے شاعر یا مصنف کا نام دیکھنے اور تصنیف کا نام معلوم کرنے کے لیے ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ قاری کی سہولت کی خاطر اور محنت اور وقت کی بچت کے لیے دکنی لغت میں لفظ سے متعلق تمام معلومات یکجا کر دی گئی ہیں تاکہ بیک نظر تمام تفصیلات سامنے آجائیں۔

دکنی میں بعض الفاظ مختلف صورتوں میں بھی رونما ہوئے ہیں۔ ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے مثال کے طور پر لفظ کھار ''کاڑ'' (نکال) کے معنی میں استعمال ہوا ہے

پالا منڈا ساکس کھار

(اشرف۔ نوسرہار)

اسی طرح ابرھن اور ابراہن، ابورپ اور ابردپ، پونہو اور پونم، ڈو گلے اور ڈو ونگے ڈھو اور ڈوہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ لغت میں ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے لفظ اسم ہے تو اس کی جنس کی وضاحت کر دی گئی ہے اور قوسین میں اسم مونث یا اسم مذکر لکھ دیا گیا ہے۔ دکنی میں بہت سے لفظ ایسے ملتے ہیں جن کی جنس مروجہ اردو میں مختلف ہے۔ موجودہ زبان میں بعض الفاظ جو مذکر استعمال کیے جاتے ہیں وہ دکنی میں مونث کی حیثیت سے رائج تھے۔ اسی طرح عہد حاضر کے بعض مونث لفظ دکنی میں مذکر برتے گئے ہیں مثلاً

ہنر کا خزاں جا کو آیا بہار

(صنعتی۔ قصہ بے نظیر)

اتھی ساری شربت میں کشمش بدام

(احمد جنیدی۔ ماہ پیکر)

موجودہ اُردو میں جیت یا شمع بطور مونث استعمال کیے جاتے ہیں لیکن آج سے پانچ ساڑھے پانچ صدی قبل یہ الفاظ ادب میں بطور مذکر لائے گئے ہیں

جلتا سو شمع بزم طرب میں نکو لیاؤ (محمد قلی قطب شاہ۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ)

جیت میرا کر دکھایا اب پڑی ہے ہوڑسی (محمود بحری۔ کلیات بحری)

یہاں یہ بات بطور خاص قابل غور ہے کہ دکنی میں بعض الفاظ مونث اور مذکر دونوں طرح استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً

انگار = (آگ)۔ مذکر۔ نکلنے لگا اس وضا میں انگار (فائز۔ رضوان شاہ و روح افزا)

انگار = (آگ)۔ مونث۔ انگار اس میں یوں ڈھک ڈھگاتی ہے لا

(غواصی۔ طوطی نامہ)

سیس (سر) مذکر۔ پھوٹن لا گیا سیس کپال (اشرف۔ نوسرہار)

سیس (سر) مونث۔ کھڑا تھا تیری سیس کیا کبل (احمد جنیدی۔ ماہ پیکر)

کھڑک (تلوار) مونث تیری ہات کی کھڑک کی دم پہ کھائے

(غواصی۔ طوطی نامہ)

کھڑک (تلوار) مذکر تیرا کھڑک نکلیا سورج سار جیوں۔ (غواصی۔ سیف الملوک و بدیع الجمال)

اسی صورت میں لفظ کے ساتھ اسم مذکر اور اسم مونث دونوں رکھ دیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی شاعر (غواصی) نے ایک لفظ کو کبھی مذکر اور کبھی مونث کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں زبان، شعری فرہنگ اور قواعد کی مختلف صورتیں اپنے تشکیلی

مراحل سے گزر رہی تھیں اور سیال حالت میں تھیں اس لیے ان میں قطعیت کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اسا کی جنس کا بھی قطعیت کے ساتھ تعین نہیں ہوا تھا۔

دکنی کے قدیم روزمرہ، ضرب الامثال اور محاورات کو بھی اس لغت میں محفوظ کردیا گیا ہے جیوکڑوا کرنا۔ ڈھول بجانا، سر پر بلا بسانا، سر پر جنجال بسانا، سر پھرنا، ہات چھوڑنا، سیس تاننا، ضرب لینا اور سنگ پکڑنا وغیرہ جیسے اظہار کے پیرائے موجودہ زبان میں اپنی جھلک نہیں دکھاتے۔

دکنی میں عربی اور فارسی کے اکثر الفاظ بدلے ہوئے املا کے ساتھ ملتے ہیں مثلاً ثریا کو ثریا، صحیح کو سہی، صبح کو صبا اور سبا، صراحی کو سرائی، وضع کو وضا یا وزا، عبث کو عبس اور علاقہ کو ایلاقہ تحریر کیا جاتا تھا۔

سریا کے تارک پہ ہے اس کا پاؤں۔ (غواصی۔ طوطی نامہ)

کہ اے نارنج حسن کا آج ڈھول

بجیا ہے گھر میں تمام اس وضا

(غواصی۔ طوطی نامہ)

دکنی میں لفظوں کو انفیانے (Nazalisation) کا رجحان عام ہے۔ یہ دکنی کی ایک لسانی اور صوتی خصوصیت ہے۔ جو لفظ انفیائے گئے ہیں ان کی نشان دہی کی گئی ہے مثلاً سنتارا (ستارا) منجلس (مجلس) سانت (سات) اور سرماں (سرمہ) وغیرہ۔ اسی طرح ہاکاری اور غیر ہاکاری الفاظ کی بھی وضاحت کردی گئی ہے۔

سہولت کی خاطر ابتدا سے لے کر ولی کے عہد تک کے تخلیق کاروں کو تین ادوار یعنی ابتدائی، وسطی اور آخری دور میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حتی الامکان الفاظ کی مثالیں منتخب کرتے وقت ہر دور کے شاعروں یا ادیبوں کی نمائندگی ہوسکے تاکہ لفظ کے تاریخی سفر اور اس کی بدلتی ہوئی حیثیت کا اندازہ ہوسکے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض قدیم الفاظ اور محاوروں کی مثالیں دکنی ادب میں کم دستیاب ہوتی ہیں، کہیں کہیں صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کی گئی ہے۔

بعض وقت ایک ہی تلفظ اور املا کے حامل دو الفاظ کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ ان میں ایک لفظ مفرد اور دوسرا دو لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کی حیثیت مرکبی ہوتی ہے مثلاً جاگا

جاگا (جگہ) نہیں اس باج نس دن کوی جاگا (احمد گجراتی۔ یوسف زلیخا)

جاگا (جائے گا) کپٹ کا سب سیاہی دل سے جاگا

(ملک خوشنود۔ جنت سنگار)

ایسے الفاظ کو لغت میں دو جداگانہ اندراجات کے تحت پیش کیا گیا ہے تاکہ دونوں لفظوں کا مفہوم خلط ملط نہ ہو۔ بعض دکنی الفاظ ایک ہی املا کے حامل ہوتے ہیں لیکن بطور اسم اور بطور فعل دونوں حیثیتوں سے برتے گئے ہیں مثلاً جالیا یعنی جلایا (فعل) اور جالیا (اسم) دونوں حیثیتوں کا حامل ہے اسی طرح ایک ہی لفظ صفت اور فعل کے طور پر استعمال ہوا ہے مثلاً چترا

دکنی میں تقلیب حروف یا تقلیب صوت کی مثالیں موجود ہیں مثلاً قفل کو کلف، کیچڑ کو چکیو، نتھا کو نھتا، جھلکنا کو جلکھنا، پگھڑی کو پھنکوی اور جھگڑا کو جگھڑا استعمال کیا گیا ہے۔

(1) دل کو حسن کے جگھڑے میں لگا تیر (وجہی۔ سب رس)

(2) دل کی مائی کو بہشت کی چکیو تے لیائے ہیں

(میراں یعقوب۔ شمائل الاتقیا)

(3) جلکھتا نام تج جیوں کھن اوپر سور۔ (ملک خوشنود۔ جنت سنگار)

دکنی لغتوں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جمیل جالبی کی ''قدیم اردو کی لغت''، مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں کی ''دکنی اردو کی لغت'' اور جاوید وششٹ کی ''بحرالمعانی'' بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ محمد صبغت اللہ اور سید ابوتراب خطائی ضامن کی لغت ''دکھنی لغت'' اگست 2000 بنگلور) کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس لغت کی تیاری میں مولفین کے الفاظ میں ''مسموعات'' بھی شامل ہیں۔'' (دکھنی لغت۔ صفحہ 3)۔ اس لغت میں الفاظ کے ساتھ ان کی مثالیں موجود نہیں ہیں۔ ''دکھنی لغت'' پر بول چال کی زبان غالب نظر آتی ہے۔ ''اِتے ڈتے میں ایل مارچ'''' (ٹال مٹول کرتے رہنے میں وقت نکل جاتا ہے'') وغیرہ۔ جمیل جالبی کی ''قدیم اردو کی لغت'' اور جاوید وششٹ کی ''بحرالمعانی'' میں دکنی متن سے مثالیں نہیں پیش کی گئی ہیں صرف الفاظ کے معنی درج ہیں۔ مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں کی ''دکنی اردو کی لغت'' میں دکنی متن سے مثالیں پیش کی گئی ہیں اور لفظ کے ماخذوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس لیے یہ لغت جمیل جالبی اور جاوید وششٹ کی لغتوں سے زیادہ جامع اور اہم ہے۔ ''دکنی اردو کی لغت'' بقول مسعود حسین خاں ''چھ سات ہزار'' الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ لغات دکنی زبان و ادب کے ماہرین کی مرتب کردہ ہیں۔ ہم نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ''دکنی لغت'' تقریباً بارہ ہزار اندراجات پر مشتمل ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ چونکہ مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں کی طرح میرا ماخذ بھی دکنی ادب اور اس کا متن تھا اس لیے اندراجات کی وضاحت کے لیے پیش کردہ مثالوں میں کہیں کہیں یکسانیت آگئی ہے اور اس سے مفر نہیں تھا۔ چونکہ لغت میں حروف تہجی کی ترتیب پیش نظر رکھی جاتی ہے اس لیے دونوں لغات میں ان الفاظ کو وہی جگہ ملی ہے جو حروف تہجی کا تقاضا تھا۔

□□□

H.No. 9-1-24/1, Langer Houz,
Hashim Nagar-500008 (A.P.)

رشید الدین

حیدرآباد میں اردو صحافت

حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز قدرے بعد میں ہوا۔ حیدرآباد میں پہلا اردو اخبار ہفت روزہ کی شکل میں محبوب علی خاں نظام ششم کے زمانے میں شائع ہوا جس کا نام "پیسہ" تھا اور جس کی قیمت بھی ایک پیسہ تھی۔

عہد عثمانی حیدرآباد میں اردو کی ترقی کا بہترین دور تھا۔ اس دور میں اردو کی پہلی یونیورسٹی دارالترجمہ اور بہت سے اہم ادارے بشمول آصفیہ لائبریری قائم ہوئے۔ نظام ہفتم میر عثمان علی خاں نے اردو کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ وہ خود بھی اردو کے شاعر تھے اور اردو کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں حیدرآباد میں اردو کے بہت سے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے جن میں "نظام گزٹ" کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے مدیر وقار احمد تھے۔

ان کی نمایاں خدمات کی بنا پر ان کو حیدرآباد کا بابائے اردو صحافت بھی کہا جاتا ہے۔ ستمبر 1948 کے بعد بھی جب کہ ریاست حیدرآباد کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی اس اخبار کو میر عثمان علی خاں کی سرپرستی حاصل رہی اور ماہانہ امداد ملتی رہی۔ ان کے فرامین اس اخبار میں پابندی سے چھپتے تھے۔ میر عثمان علی خاں کنگ کوٹھی نذری باغ میں رہتے تھے اور وہاں سے "نظام گزٹ" کے لیے فرامین بھجواتے تھے۔ یہ فرامین خانگی نوعیت کے ہوتے تھے جنھیں آخری صفحے کے درمیان میں بائیں طرف دیا جاتا تھا اور اس کی کتابت جلی کرائی جاتی تھی۔ آخر میں بریکٹ میں "آمدہ از نذری باغ" لکھا ہوتا تھا۔ یہ فرمان لفظ "فرمایا" سے شروع ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ سابق بادشاہ اپنے قلم سے فرمایا لکھتے تھے۔ زبان بہت خاص قسم کی ہوتی تھی۔ عبارت عموماً اس قسم کی ہوتی "فرمایا انقلاب زمانہ سے حالات دگرگوں ہیں۔ گردش زمانہ سدا ایک نہیں ہوتی۔ چرخ نئے نئے تماشے دکھاتا ہے۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ زمانے کے لحاظ سے چلنا چاہیے۔ اسی میں کامیابی اور بھلائی ہے" وغیرہ۔

حیدرآباد کا دوسرا اخبار "رہبر دکن" تھا۔ اس کے مدیر محی الدین قادری تھے۔ سقوط حیدرآباد سے پہلے یہ اردو کا ایک مقبول اخبار تھا اور شہر کے علاوہ اضلاع میں بھی پڑھا جاتا تھا۔ اس کے دوسرے صفحے پر ایک قرآنی آیت اور ایک حدیث کا اردو ترجمہ درج ہوتا تھا۔ چوتھے صفحے پر تازہ ترین خبریں ہوتی تھیں۔ اس کالم پر لکھا ہوتا تھا "تازہ ترین تار"۔ اس میں اشتہارات وافر مقدار میں ہوتے تھے جن میں فلمی اشتہار بھی ہوتے تھے۔

"نظام گزٹ" اور "رہبر دکن" کے علاوہ اس زمانے میں حیدرآباد سے اردو کے اور بھی بہت سے اخبارات نکلے جن میں "میزان"، "جناح" اور "وقت" بھی تھے۔ میزان تین زبانوں اردو، انگریزی اور تلگو میں نکلتا تھا۔ اس کے مدیر اور مالک غلام احمد کلکتہ والے تھے۔ ان پانچ اخبارات کے علاوہ بعض چھوٹے اخبارات بھی اس زمانے میں شہر حیدرآباد سے نکلتے تھے۔ یہ زمانہ اردو اور میر عثمان علی خاں کے عروج کا زمانہ تھا۔

سقوط حیدرآباد کے بعد "رہبر دکن" کا نام "رہنمائے دکن" کر دیا گیا۔ اسی طرح روزنامہ "جناح" کا نام روزنامہ "منزل" کر دیا گیا۔ حیدرآباد سے ایک نیا اردو اخبار "ملاپ" نکلنے لگا جس کے مدیر اور مالک بدھ دیر جی تھے۔ انھیں ایک مہاجر کی حیثیت سے ایک اردو اخبار "وقت" کا دفتر اور پریس ملا تھا بہت جلد "ملاپ" سب سے کثیر الاشاعت اخبار بن گیا۔ اس کا ایک روشن پہلو یہ تھا کہ ملاپ والوں نے کاتبوں اور سب ایڈیٹروں کو لاہور اور دلی کی اجرتیں دیں، جو ظاہر ہے حیدرآباد سے بہت زیادہ تھیں۔ 15 اگست 1949 سے عابد علی خاں نے روزنامہ "سیاست" کی اشاعت شروع کی۔ اس اخبار نے جس کی پالیسی بائیں بازو کی یعنی سیکولر اور ترقی پسندانہ تھی بعد میں بہت ترقی کی اور زاہد علی خاں کی ادارت میں یہ اخبار آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ عابد علی خاں کو اس میں اپنے دوست محبوب حسین جگر کی بھی اعانت حاصل تھی جنھوں نے اپنا سب کچھ "سیاست" کی نذر کر دیا۔ "سیاست" نے اردو داں افراد اور مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند کیے اور پڑھے لکھے اور متمول مسلمانوں کو پاکستان جانے سے روکا۔

"سیاست" کے بعد حیدرآباد سے اور بھی اردو اخبارات نکلے، جن میں "ہمارا قدم"، "انگارے" اور بعض دوسرے چھوٹے اخبارات شامل تھے۔ حیدرآباد سے اردو کا ایک ہفت روزہ "منصف" کے نام سے نکلتا تھا جس کا روزنامہ کا ڈکلیریشن لے کر محمود انصاری نے نئے انتظامات کے ساتھ نکالا۔ محمود انصاری نوجوان صحافی تھے جنھوں نے روزنامہ "سیاست" میں خاص طور پر دس سال تجربہ حاصل کیا تھا۔ "منصف" تقریباً دس سال تک نکلتا رہا۔ جب اس کے ایڈیٹر محمود انصاری کا انتقال ہو گیا تو کچھ عرصے ان کے بڑے بھائی مسعود انصاری نے اس کی اشاعت کی ذمے داری سنبھالی اور جب وہ بھی بیمار ہو گئے تو اسے انھوں نے خان لطیف خاں کو فروخت کر دیا۔ "منصف" آج حیدرآباد کا کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ اس میں قابل مطالعہ مواد بہت زیادہ ہوتا ہے، اس میں انگریزی اخباروں کی طرح ایک درمیانی صفحہ ہوتا ہے جس پر اداریہ کے علاوہ ایک سیاسی مضمون اور ایک مزاحیہ مضمون شامل ہوتا ہے۔ "منصف" نے ہر روز ایک سالمعہ کا رواج شروع ہے جس کے تتبع میں تمام

اخبارات اب روز ایک چار صفحہ کا سپلمنٹ شائع کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ "منصف" نے نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ ملکی پیمانے پر اردو صحافت کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔

کے ایم عارف الدین نے شاہد صدیقی (جو دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "نئی دنیا" اور روزنامہ "عوام" کے مدیر ہیں) کے ساتھ مل کر عوام کا ایڈیشن حیدرآباد سے بھی نکالا۔ اس طرح یہ دلی اور حیدرآباد سے بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ بعد میں کے ایم عارف الدین نے اسے "ہمارا عوام" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس طرح اس وقت حیدرآباد سے چار بڑے اور معیاری روزنامے "رہنمائے دکن"، "سیاست"، "منصف" اور "ہمارا عوام" پابندی سے شائع ہو رہے ہیں اور یہ پوری طرح آراستہ و رنگین ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اردو کا ایک اور قابلِ ذکر روزنامہ "ساز دکن" بھی شائع ہو رہا ہے جس کے ایڈیٹر باقر حسین شاد ہیں۔ اس طرح حیدرآباد سے فی الوقت پانچ روزنامے نکلتے ہیں۔ حیدرآباد سے ماضی میں بھی پانچ روزنامے "رہبر دکن"، "نظام گزٹ"، "میزان"، "وقت" اور "جناح" شائع ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد دلی، جالندھر اور حیدرآباد سے نکلنے والا روزنامہ "ملاپ" چند سال پہلے اس کے ایڈیٹر بدھ ویر جی کے انتقال کے بعد بند ہوگیا مگر ہندی "ملاپ" جاری ہے۔ دلّی، ممبئی، کلکتہ اور بنگلور کی طرح حیدرآباد میں بھی اردو صحافت ترقی پذیر ہے جو حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کے روشن اور تابناک مستقبل کی ضامن ہے۔

□□□

Santosh Nagar Colony, Mehdi Patnam,
Hyderabad-28

جراثیم

مصنف: سی وی سبرامنین / مترجم: شریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت -/36 روپے

چٹانیں بولتی ہیں

مصنف: وشنو متر / مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔

صفحات: 85، قیمت: -/21 روپے

لڑھکتا پہیا

مصنف: آشا نہمیا، مترجم: ڈاکٹر صغریٰ مہدی

سرکس دیکھنا بچوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ راموا اور کملا سرکس دیکھنے کے لیے ٹریکٹر پر سوار ہو کر شہر چلے۔ راستے میں ایک بے حد دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ تفصیلات جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

دائی اور بھوت

مصنف: دیپیکا رنگا چاری، مترجم: شمیمہ بیگم

بھوتوں سے عام طور سے بچے ڈرتے ہیں۔ روی بھی ایک ایسا ہی لڑکا تھا جسے بھوت سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن جب دائی سے اس کی دوستی ہوئی تو یہ خوف جاتا رہا۔ ایک دلچسپ کہانی جو بچوں کو ضرور پسند آئے گی۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

ڈاکیہ

مصنف: آر. کے. مورتی، مترجم: نجمہ نقوی

ایک بار جنگل کے راجا شیر نے ڈاکیے کے تقرر کے لیے ایک مقابلہ جاتی امتحان منعقد کیا جس میں جنگل کے بہت سے پرندوں اور جانوروں نے شرکت کی۔ لیکن اس میں کامیابی کنگارو کو ملی۔ یہ کامیابی اسے کیسے ملی، یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 16، قیمت: 15 روپے

پتھروں کے دل

مصنف: وشا کا چنچی، مترجم: غلام حیدر

بچوں کو جادو منتر والی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ "پتھروں کے دل" میں بھی ایسی ہی ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی زمانے میں پتھروں کے بھی دل ہوا کرتے تھے لیکن ایک جادوگرنی نے اپنے جادو کے زور سے انھیں دل سے محروم کر دیا۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فیروز بخت احمد

دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال

پرانی دہلی کے فصیل بند شہر کے اردو میڈیم اسکول جمود کا شکار ہیں۔ تعلیمی ماحول کا فقدان، اساتذہ کی عدم دلچسپی، طلبہ میں آوارہ گردی کا بڑھتا رجحان، بچوں میں کسی نصب العین کی عدم موجودگی اور ناکافی تعلیمی سہولتیں ان اسکولوں کا شعار بن چکی ہیں۔ ان اسکولوں کی کارکردگی بھی روبہ انحطاط ہے۔ اس سلسلے میں بیشتر لوگوں کی شکایت یہ ہے کہ اردو کی درسی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ان اسکولوں کی عمارتیں بھی بے توجہی کے باعث خستہ حال ہو چکی ہیں۔ اسی طرح بچوں کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہونے کی ایک وجہ غیر دلچسپ نصاب تعلیم بھی ہے۔

اس سلسلے میں چند مسائل پرانی دہلی کی گھنی آبادی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جہاں تقریباً سات لاکھ کی آبادی ہے۔ جبکہ شاہجہاں آباد کے منصوبہ سازوں نے اس کی منصوبہ بندی اس طرز پر کی تھی کہ یہاں کم از کم ساٹھ ہزار لوگ آباد ہو سکیں۔ پھر تقریباً یہاں کی عمارتیں ایک طرف فیکٹریوں کا منظر پیش کرتی ہیں، ان فیکٹریوں سے نکلنے والا زہریلا دھواں، تیز شور وغل، اور فرقہ وارانہ امن کے لیے مستقل خطرہ وغیرہ، عوامل بھی تعلیمی ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تعلیمی ماحول خراب ہونے کی ایک وجہ اساتذہ کی کم تنخواہ بھی ہے۔ کئی ایسے اسکول ہیں جن میں ایک سال میں ایک ہی مضمون کے نو اساتذہ کا یکے بعد دیگرے تقرر ہوا۔ یہ طے ہے کہ جب تک قابل اساتذہ مناسب مشاہرے کے ساتھ مہیا نہیں ہوں گے تب تک معیار بہتر نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اس کی سب سے زیادہ ذمے داری انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے دور کے اساتذہ بھی اس مقدس پیشے کو تجارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ ایک دور تھا جب اساتذہ واقعتاً ''استاد فن'' ہوتے تھے لیکن فی زمانہ قدریں بدل چکی ہیں۔ تلاش معاش نے ایک وکیل کو بھی اسکول ٹیچر بننے پر مجبور کر دیا ہے اور ایک ڈاکٹر کو بھی، اس لیے اکثر اساتذہ حضرات کی نظریں بچوں کے مستقبل پر نہیں بلکہ اپنے مستقبل پر ہوتی ہیں۔

پیشہ ور اساتذہ کی حالت یہ ہے کہ وہ بچے کو زبردستی ٹیوشن کی دلدل میں پھنسنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سرپرست حضرات سے بھی ''سودے بازیاں'' ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر امتحان کی کامیابی تک کا ٹھیکا لے لیا جاتا ہے۔ تقریباً ہر اسکول اساتذہ کے گروہوں میں منقسم ہے۔ الف گروہ اساتذہ کا کوئی بچہ اگر بی گروہ اساتذہ کے ''شکنجے'' میں پھنس جائے تو وہ مزا چکھایا جاتا ہے کہ الحفیظ الاماں۔ انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے بچوں کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ ٹیوشن کی حالت یہ ہے کہ اسکول کے ہی خالی گھنٹوں میں ٹیوشن پڑھا دی جاتی ہے اور وہ بھی کلاس کی شکل میں۔ اساتذہ کے اس رویے نے جہاں ان کی قدر و منزلت طلبہ کے دلوں سے نکال دی ہے وہیں علم کی راہیں بھی بچوں پر دشوار کر دی ہیں۔

پیشہ ور اساتذہ سے کہیں بہتر وہ اساتذہ ہیں جو اپنے مستقبل پر نظر رکھ کر اسکولوں کو خیرباد کہنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ معاشرے کو عتاب ''بالی انتظام'' کی کوششوں نے کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایسا نہیں ہے کہ سماج میں اچھے لوگ نہیں ہیں لیکن خرابیوں کی کثرت نے ان کی ایسی پردہ دری کر دی ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا یکساں لگنے لگا ہے۔ کل ملا کر مذکورہ بالا صورت حال نے اردو میڈیم اسکولوں کا وجود خطرے میں ڈال دیا ہے۔ منتظمین حضرات کی سرد مہری، اساتذہ کی غیر ذمے داری، سرپرست صاحبان کی لاپروائی اور طلبہ کی غفلت نے ماحول کو اس حد تک خراب کر دیا ہے کہ ''خواندہ خاندانوں'' کو اردو میڈیم اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخلہ دلاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ بدرجۂ مجبوری اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اس بچے کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی اور اگر کسی سے بچے کی پڑھائی کے متعلق بتایا جاتا ہے تو بڑے ناگوار انداز میں اسکول کا تذکرہ کیا جاتا ہے کچھ اساتذہ اگر ایمانداری سے کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تاکہ وہ بھی انھیں جیسے ہو جائیں۔

یہ صورت حال افسوس ناک ہے اور ''قوم'' کے غم میں ''ڈنر'' کھانے والے قائدین کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے اور ان کے لیے بھی جو واقعتاً قوم کا درد رکھتے ہیں۔ ایسوی ایشن نے ان اسکولوں کے طلبہ کے 5000 والدین کو سوالنامے ارسال کیے تھے لیکن صرف 900 (18 فیصد) والدین نے اس کا جواب دیا۔ سروے ٹیم نے تقریباً 500 خاندانوں سے ملاقاتیں کیں جن کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ اس ٹیم نے جائزے میں پایا کہ محض 7.8 فیصد طلبہ کے والدین گریجویٹ 25 فیصد بچوں کے والدین میٹرک پاس، جبکہ 42 فیصد کے والدین ناخواندہ ہیں۔ اسّی فیصد بچے پیدل اسکول جاتے ہیں جبکہ بقیہ بس یا بذریعۂ رکشہ اسکول جاتے ہیں۔

کچھ طلبہ نے یہ شکایت کی کہ اساتذہ ان کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر لیا۔ اس علاقے کے قدیم ترین اسکولوں میں سے ایک اجمیری گیٹ میں واقع اینگلو عربک اسکول کا حال یہ ہے کہ سائنس کے ایک ٹیچر نے تعلیمی سال میں صرف دو کلاسیں لی ہیں۔ وہ دو کلاسیں ہی لیتے ہیں اور جب ایک طالب علم نے اس کی شکایت کی تو اس سے کہا گیا کہ گریس مارک (اضافی نمبر) دے کر تمھیں کامیاب کر دیا جائے گا۔ ایک دوسرے طالب علم کو تین امکانی سوالات دیے گئے اور اس سے کہا گیا کہ تم اسی کی بنیاد پر امتحانات کی تیاری کرو۔ اکثر اسکولوں میں اساتذہ طلبہ کو پرائیویٹ ٹیوشن کلاس میں حاضر ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسکول سے متعلق کچھ اور تشویشناک شکایتیں ملی ہیں۔ اسکول کے ہی کچھ ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں پر شادی بیاہوں پر جو جمنازیم ہال کرایے پر دیا جاتا ہے، اس کا کرایہ رجسٹر میں 6200 روپے اور ساتھ میں پانچ سو روپے دیگر صفائی وغیرہ کا نوٹ کرایا جاتا ہے مگر اس کے اوپر بھی بڑی رقومات حاصل کی جاتی ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور نہ ہی کوئی رسید دی جاتی ہے۔ حال میں ہی علاقے کے کارپوریٹر جناب اشوک جین نے اسکول کو سیور لائن بدلنے کے لیے 17 لاکھ اور سابق ممبر پارلیمنٹ وجے گوئل نے 22 لاکھ روپے اسکول کی مرمت کے

● فرینڈس فار ایجوکیشن دہلی کی ایک رضاکار تنظیم ہے جس کی طرف سے ہر سال تعلیمی رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ حال ہی میں تیار کی گئی اس سال کی جائزہ رپورٹ قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

لیے اپنے فنڈ سے فراہم کرائے۔ اس رقم کا حساب بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔

پچھلے دنوں اسکول کی بوسیدہ عمارت کے ایک کمرے کی چھت سے ایک سل کئی روز تک خطرناک طور سے جھولتی رہی اور اس کی شکایت بھی کی گئی مگر اس کا کوئی نوٹس پرنسپل جناب اختر الزماں کے ذریعے نہیں لیا گیا۔ لہٰذا ایک دن ہوا یہ کہ یہ سل نیچے گری اور ایک بچہ بال بال بچ گیا۔ جس مضبوط میز کے اوپر یہ سل گری، اس کے پر خچے اڑ گئے۔ ابھی حال کی بات ہے کہ اسکول کے تین وہ ملازمین ایک ساتھ غیر حاضر ہو گئے جن کے پاس کمروں کی چابیاں تھیں۔ سینکڑوں بچے باہر کھڑے رہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ پرنسپل صاحب کے کمرے میں ڈپلیکیٹ چابیوں کا گچھا نہیں تھا۔ کچھ اس قسم کی شکایتیں بھی آرہی ہیں جو لوگ اسکول کے 51 کمروں پر قابض ہیں، پرنسپل صاحب ان کو خالی کرانے کے لیے کوئی بہت زیادہ کوشاں نہیں ہیں۔ ایسا بھی سنا گیا ہے کہ اسکول کے کچھ اساتذہ کی قابض حضرات کے ساتھ سازباز ہے۔ آٹھویں بی کے ایک بچے نے شکایت کی کہ اپریل سے یعنی سیشن کے شروع سے ان کا چھٹا پیریڈ لگا ہی نہیں ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ بچوں کو یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ کس مضمون یا استاد کا پیریڈ ہے۔ نئے کمروں میں بسی چھٹی کلاس کے بچوں نے ایک دن ساڑھے بارہ بجے بتایا کہ اسمبلی کے بعد ان کی کوئی کلاس ہی نہیں لگی۔ زیادہ تر کلاسوں سے اسی قسم کی شکایت موصول ہوئی کہ اکثر اساتذہ کلاس نہیں لیتے اور شکایت کرنے پر بچوں کو فیل کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بورڈ کی دسویں اور بارہویں میں ان درس گاہوں کا اجتماعی نتیجہ 30-25 فیصد ہی رہتا ہے۔ ایک بچے کے والد نے شکایت کی کہ ان کے دو لڑکے جامع مسجد سینئر سیکنڈری اسکول میں پچھلے دس برس سے زیرِ تعلیم ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انگریزی نہیں لکھ سکتے ہیں۔ جائزے میں یہ باتیں بھی سامنے آئیں کہ صرف 12 فیصد ایسے والدین یا سرپرست ہیں جو اپنے بچوں کے اسکولی لوازمات مثلاً یونیفارم، اسکولی فیس، جوتا، پالش، درسی کتابیں، قلم، نقشے، کلر باکس اور جیومیٹری باکس، وغیرہ آسانی سے فراہم کر سکتے ہیں۔ 64 فی صد والدین کا کہنا ہے کہ وہ بڑی مشکل سے یہ لوازمات فراہم کرتے ہیں جبکہ وہ یہ چیزیں فراہم کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔ تقریباً 85 فیصد گارجین اپنے بچوں کو اضافی تعلیمی سرگرمیوں جیسے ڈراما، مسابقت، کھیل کود، تصویر کشی کا مقابلہ وغیرہ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔

جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ پرانی دہلی کے بچے فٹ بال، کرکٹ، ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن، ہاکی، باسکٹ بال، والی بال، وغیرہ کھیلوں میں دلچسپی رکھتے ہیں مگر مطلوبہ میدان و جمنازیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کھیلوں میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں۔ ان اسکولوں میں تعلیمی کارکردگی کی تنزلی کا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگتا ہے کہ 1995 میں ابتدائی جماعتوں میں فیل ہونے طلبہ کی شرح پانچ فیصد تھی جبکہ یہ شرح 2005 میں بڑھ کر آٹھ فیصد ہو گئی۔ اسی طرح اس عرصے یعنی 1995 تا 2005 کے دوران مڈل اسکولوں میں فیل ہونے والوں کی شرح بالترتیب 9 فیصد اور 12 فیصد، سیکنڈری اسکولوں میں 17 فیصد اور 26.6 فیصد اور سینئر سیکنڈری اسکولوں میں 19 فیصد و 28.2 فیصد رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرائمری اسکولوں میں فیل ہونے والے طلبہ کی شرح کم کیوں ہے؟ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اپنے اعلا افسروں کی سرزنش کے خوف سے کمزور طلبہ کو بھی کامیاب کر دیتے ہیں۔

پرانی دہلی میں جن بچوں کا سروے کیا گیا ان میں 64 فی صد طلبہ اردو میڈیم اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں جبکہ 2.4 فیصد انگلش اور ہندی میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ جہاں تک والدین کی اوسط آمدنی کا سوال ہے تو سروے میں انکشاف ہوا کہ ان کی اوسط آمدنی ماہانہ 500 تا 2000 روپے کے درمیان ہے جن لوگوں کی ماہانہ آمدنی اس سے بھی کم ہے وہ اپنے بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں جہاں یہ کارٹون بنانے، پین کلپ، برقی استریاں، پلاسٹک مصنوعات، بک بائنڈنگ اور قلعی سازی کا کام کرتے ہیں۔

دوسری طرف اسکولوں کے ٹیچروں کی شکایت یہ ہے کہ اردو زبان میں درسی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ حالانکہ دہلی ایسا شہر ہے جہاں مشاعروں کی محفلیں اور اردو کانفرنسیں وقفے وقفے سے منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ پھر ان طلبہ کو بیچ میں ہی ذریعۂ تعلیم بدل جانے کے باعث کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ذریعۂ تعلیم وہاں ہندی یا انگلش ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ اردو میڈیم سے اپنی کلاسوں میں بہت اچھا مقام حاصل کیے ہوتے ہیں وہ یہاں آکر فیل ہو جاتے ہیں یا کم نمبر حاصل کر پاتے ہیں۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو طلبہ تعلیمی سلسلہ منقطع کر چکے تھے ان میں 38 فیصد کا کہنا ہے کہ ٹیچروں کی عدم توجہی کے باعث انھوں نے اسکول چھوڑا۔ 18 فیصد کا کہنا ہے کہ دیگر طلبہ کی ان کے تئیں سرد مہری نے انھیں اسکول چھوڑنے پر مجبور کیا جبکہ 29 فیصد کا کہنا ہے کہ ان کے والدین تعلیم سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

اس علاقے کے تمام اسکولوں میں علاوہ ایک کے کسی میں بھی کھیل کود کی سہولتیں نہیں ہیں اور نہ ہی کسی اسکول میں آڈیٹوریم ہے۔ ان اسکولوں میں سیر و سیاحت، پکنک وغیرہ کے پروگرام، تقریر اور پینٹنگ مقابلہ وغیرہ، ثقافتی پروگرام کبھی منعقد نہیں کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ قومی دارالحکومت ہونے کے باعث دہلی میں اس طرح کی ثقافتی سرگرمیاں برابر جاری رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ہر چہار طرف دلچسپ تاریخی مقامات، آگرہ، مہرولی، جے پور وغیرہ یا پھر شملہ، چنڈی گڑھ اور دہرہ دون جیسے خوبصورت شہر واقع ہیں۔

زیادہ تر طلبہ اس سلسلے میں خالی الذہن ہیں کہ وہ مستقبل میں کیا کریں گے، تقریباً 84 فی صد طلبہ ان خیالات کے اظہار سے بھی قاصر ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے جن طلبہ نے اپنی زندگی کے مقصد کا برملا اظہار کیا ان میں سے آٹھ فیصد نے مقصد اسکول ٹیچر بننا بتایا۔ 22 فیصد نے میڈیکل تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی جبکہ 22.4 فیصد نے تجارت میں دلچسپی دکھائی۔ اسی طرح بیشتر طلبہ آئی۔ اے۔ ایس۔، این۔ ڈی۔ اے۔، آئی۔ ایم۔ اے۔ یا اے۔ ایف۔ ایم۔ سی۔ جیسے مخففات کی مکمل عبارت سے نابلد پائے گئے۔

انھی اسکولوں میں سے دہلی کی عیدگاہ میں 1976 میں ایمرجنسی کے دوران منہدم کیا گیا ایک قومی سینئر سیکنڈری اسکول ہنوز پختہ عمارت سے محروم ہے اور اسے خیموں میں چلایا جا رہا ہے۔ بعض اوقات تو کھلے آسمان میں بھی درس و تدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اسکول میں اساتذہ کی آپسی چپقلش کی وجہ سے محکمۂ تعلیم نے اسکول کا مالی تعاون بند کر کے یہاں کے اساتذہ پر اور بھی ظلم کیا کیوں کہ ان کو پورے چھ مہینے تنخواہ ہی نہیں ملی۔ یہاں آندھی ہو یا طوفان یا آسمان سے گرمی کے موسم کے دوران آگ برس رہی ہو، بچے پھٹے پرانے خیموں میں ہی پڑھنے پر مجبور ہیں۔

A-202, Adeeba, Market & Apartment,
Near Rehmani Masjid, Zakir Nagar, New Delhi □□□

اظہار اثر

زبان اور تحریر کا سفر

جب انسان آپس میں باتیں کرتے ہیں تو وہ آواز کو اشاروں (Symbol) کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بہت سی زبانوں کے کچھ الفاظ دوسری زبانوں میں بولنے پر ایک جیسے ہی محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کے معنی جدا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً جب پارکر قلم بنانے والی کمپنی نے اپنا پہلا بال پین بنایا اور اس کو اسپین بھیجا تو اس نے قلم کی تعریف میں اسپینی زبان میں جملہ بنایا، جس کا مطلب ہوتا تھا۔

یہ قلم آپ کی جیب میں ''لیک'' نہیں کرے گا اور آپ کو شرمندہ ہونے سے بچالے گا۔''

یہ جملہ تمام اخباروں میں بطور اشتہار چھپ گیا۔ اس جملے میں شرمندہ ہونے کے معنی میں انگریزی کا لفظ Embarrass استعمال کیا گیا تھا لیکن اسپینی زبان میں اسی تلفظ کا ایک لفظ Embarazer بولا جاتا ہے۔ تلفظ کی مشابہت کے باوجود دونوں لفظوں کے معنوں میں بہت فرق تھا۔ صرف اس لفظ سے اسپینی زبان میں اس اشتہار کا مطلب اس طرح ہوگیا تھا۔

" یہ قلم آپ کی جیب میں لیک نہیں کرے گا اور آپ کو حاملہ بھی بنادے گا۔"

اشتہار چھپنے کے بعد اسپینی لوگوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا تو پارکر کمپنی کو اپنے تمام اشتہار بورڈ اتروانے پڑے اور اخباروں میں بھی اشتہار بدلوانے پڑے۔ اسی طرح فورڈ کمپنی نے جب اپنی پہلی چھوٹی کار بنائی تو اس کا نام ''پنٹو'' (Pinto) رکھا لیکن جب یہ کار اس نام کے ساتھ برازیل گئی تو اس کا بہت مذاق اڑایا گیا کیونکہ لفظ Pinto برازیلی زبان میں عضو تناسل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شرمندہ ہوکر کمپنی کو اپنی کار کا نام برازیل میں بدلنا پڑا۔

یہ زبان کے لطیفے اور کرشمے ہیں۔ اس طرح کے چٹکلے ہم اکثر سنتے رہتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں لیکن کیا کبھی سنجیدگی سے کوئی سوچتا ہے کہ زبان وجود میں کیسے آئی، الفاظ کی یہ علامتیں کس نے بنائیں۔

انسان لاکھوں سال سے اس زمین پر آباد ہے۔ ہزاروں سال پہلے کا انسان غاروں میں رہتا تھا اور جانوروں کی طرح ہی زندگی گزارتا تھا۔ یعنی جنگلی پھلوں اور جانوروں کا شکار کرکے اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس زمانے کا انسان اپنی بات دوسرے انسان کو کیسے سمجھاتا تھا۔ انسانوں کے قبیلے الگ الگ مقامات پر رہتے تھے اس لیے سب ایک ہی طرح کے اشارے یا سمبل استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ پھر زبان کیسے بنی، ان قبیلوں کے افراد نے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کے لیے کس طرح کے ذرائع اختیار کیے؟

زبان پر تحقیق کرنے والوں نے اس سلسلے میں دو نظریات پیش کیے ہیں جن میں سے ایک نظریہ "Interjectional" کہلاتا ہے یعنی کسی چیز کا اچانک دخل انداز ہونا اور دوسرا نظریہ Sound Immitative کہلاتا ہے یعنی آواز کی نقل کرنا۔ پہلے نظریے کے مطابق انسان کے حلق سے جو آوازیں اچانک نکلتی ہیں وہ ہر انسان تقریباً یکساں طور پر نکالتا ہے مثال کے طور پر جب ہم جسم کے کسی حصے میں اچانک کوئی تکلیف محسوس کرتے ہیں تو ہمارے منہ سے خود بخود ''اوہ یا آہ'' کی آواز نکلتی ہے۔ یہ آواز ہمارے منہ سے اچانک نکل جاتی ہے چاہے ہم کسی بھی زبان میں باتیں کررہے ہوں۔ ایک لمبا اوہ۔ہ۔ یا واؤ اور واہ کی آوازیں اس وقت نکلتی ہیں جب اچانک کسی چیز کو دیکھ کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ کسی اچانک صدمے پر چیخ مارنا، ڈر کر حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا، سب اسی نظریے کے تحت آتی ہیں بعد میں یہی آوازیں علامتیں یا اشارے بنتی چلی گئیں لیکن محقق دوسرے نظریے کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ اس میں دوسروں کی آوازیں نقل کی جاتی ہیں مثلاً ''میاؤں'' کی آواز بلی نکالتی ہے یہی آواز بدل کر چیخ کی سی صورت بن جاتی ہے۔ کتے کی آواز بھوں بھوں کسی انجن کی آواز ٹن ٹن، کسی گھنٹی کی آواز کی نقل اتار کر انسان بہت سی چیزوں کی طرف اشارہ کرسکتا ہے۔

آوازوں کی نقل کے لیے ایک یونانی زبان کا لفظ Onomatopoeic بولا جاتا ہے اس کا مطلب ناموں کی تشکیل کرنا ہوتا ہے۔

اچانک آوازیں نکلنے کے نظریے کو محققین اس لیے کمزور سمجھتے ہیں کہ رونے یا چیخنے کی آوازوں کی بنیاد اُس خوشی، دکھ یا اچانک صدمے پر منحصر ہوتی ہے جسے محسوس کرکے انسان کے منہ سے آواز نکل جاتی ہے۔ چیخ بہت چھوٹی اور بہت لمبی بھی ہوسکتی ہے۔ کسی اچانک واقعے پر انسان کے حلق سے نکلنے والی آوازیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

اسی طرح آوازوں کی نقل کرنے والے نظریے کو بھی بالکل درست نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں جن کی نقل کرنے پر سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ وہ آواز کیسی ہے یا کیا ہے لیکن اگر دس آدمیوں کو ریڈیو میں

کھڑ بڑ ہونے والی آوازیں سنا کر پوچھا جائے کہ وہ اس آواز کو کس چیز سے تشبیہ دیں گے تو ان میں سے ہر آدمی کا جواب الگ ہوگا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان کسی قانون یا اصول کے تحت نہیں بنتی بلکہ ضرورت کے تحت آزادانہ طور پر الفاظ وجود میں آتے گئے۔ مثلاً لفظ "اونٹ" میں اونٹ کی کوئی مشابہت نہیں، فارسی میں اونٹ کو "شتر" اور انگریزی میں کیمل کہا جاتا ہے۔ ان تینوں زبانوں کو سمجھنے والے ان الفاظ کو سنتے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اونٹ ایک خاص شکل کا جانور ہے۔

ضرورت اور خودمختارانہ طور پر کسی آواز کی بناوٹ موقعہ ومحل کے مطابق ہوسکتی ہے مثلاً جب انسان نے الفاظ بنانا نہیں سیکھا تھا اس وقت اسے اپنی بات سمجھانے میں بہت دقت ہوتی ہوگی۔ جب کسی قبیلے کا کوئی فرد جنگل میں کسی بڑے جانور کا شکار کر لیتا ہوگا تو اسے اپنی مدد کے لیے دوسرے ساتھیوں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہوگی اس کے لیے وہ اپنے رہائشی غار میں آکر دوسرے لوگوں کو کچھ آوازیں نکال کر اور کچھ اشاروں کے ذریعے سمجھاتا ہوگا کہ اس نے ایک بڑے جانور کا شکار کرلیا ہے اور اس کے ان اشاروں اور آوازوں کو سمجھ کر قبیلے کے دوسرے لوگ اس کی مدد کو چل پڑتے ہوں گے۔ پھر وہ شکاری اپنے ساتھیوں کو طرح طرح کے اشاروں اور آوازوں سے سمجھاتا ہوگا کہ شکار کی کھال کس طرح اتاری جائے اور اس کا گوشت ٹکڑوں میں کاٹ کر کس طرح سے کھایا جائے۔ دھیرے دھیرے آوازوں کے یہ اشارے الفاظ بنتے چلے گئے۔ گویا طرح طرح کے موقعوں پر طرح طرح کی آوازیں الفاظ کا روپ لیتی چلی گئیں جن کے معنی ہر شخص سمجھنے لگا۔

ابتدائی زمانے میں لوگ اپنی بات سمجھانے کے لیے بہت کم الفاظ یا اشاروں سے کام چلا لیتے ہوں گے۔ اس بات کا ایک ثبوت ابھی چند سال پہلے سائنس دانوں کو ملا ہے۔ جنوبی امریکہ کے آری زونا کے جنگلات بہت خطرناک مانے جاتے ہیں، ان جنگلات میں بہت کم لوگ جانے کی جرأت کرتے ہیں۔ آٹھ دس سال پہلے سائنسدانوں کا ایک گروہ جدید آلات کی مدد سے ان جنگلات کا مشاہدہ کر رہا تھا تو انھیں جنگل کے اندر بہت دور ایک کھلا میدان ملا جہاں درخت کم تھے اور کچھ پہاڑیاں تھیں۔ اس میدان میں انسانوں کا ایک قبیلہ آباد تھا جو افریقہ کے قبائل سے بالکل مختلف تھے۔ اس قبیلے کی پوری آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ جانوروں کا شکار کرکے اور کچھ چیزیں زمین پر اُگا کر زندگی گزارتے تھے۔ یہ لوگ گورے رنگ کے خوبصورت انسان تھے، انھوں نے بات چیت کے لیے اپنی زبان خود بنائی تھی جو دنیا کی کسی زبان سے مشابہہ نہیں تھی اور ان کی زبان کی پوری لغت صرف سولہ الفاظ پر مشتمل تھی یعنی وہ سولہ الفاظ کے ذریعے ہی ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا دیتے تھے۔ اپنے جذبات کا اظہار بھی انھی الفاظ کے ذریعے کرتے تھے۔ شاید وہ لہجہ اور چہرے کے تاثرات بدل کر ہر لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے ماہرین کا خیال تھا کہ کسی بھی ابتدائی زبان میں پانچ سو لفظ ضرور ہوتے ہیں۔ ایک بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ہر جاندار بولتا ہے، اپنی نسل کے مطابق آوازیں نکالتا ہے لیکن کسی آواز کو لفظ کا روپ دینا صرف انسان نے سیکھا ہے جسے ہم صرف بولنا نہیں کہہ سکتے بلکہ کچھ کہنا یا بات کرنا کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا کے ہر حصے میں آباد لوگوں نے اپنی ضرورت، سہولت اور عقل کے مطابق آواز کو لفظوں کی شکل دے کر زبان ایجاد کی، یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف دنیا کے ہر علاقے کی زبان الگ ہے بلکہ زبان کے لہجے (Accent) میں بھی فرق ہے۔ لسانیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ ہر پچیس تیس میل کے بعد ایک ہی زبان کے لہجے میں فرق آتا چلا جاتا ہے۔

دھیرے دھیرے غاروں میں سمٹے ہوئے قبیلے مل کر رہنے لگے اور چھوٹی چھوٹی آبادیاں اور گاؤں وجود میں آتے چلے گئے۔ اس کے بعد انسان کے سامنے دوسرا مسئلہ آیا کہ کسی بات کو یاد کیسے رکھا جائے اور دوردراز کے رہنے والے لوگوں تک اپنا پیغام کیسے پہنچایا جائے۔ یا ایک ہی جگہ کے رہنے والے اپنے غیر موجود ساتھیوں کے لیے پیغامات کیسے چھوڑ کر جائیں کہ وہ کہاں جارہے ہیں یا ان کے جانے کے بعد ان لوگوں کو کیا کیا کرنا ہوگا۔ اس وقت تک لوگوں کے ذہن میں تحریر کا تصور بھی نہیں تھا۔ تحریر کی ابتدا یا پہلی کوشش تو 1800ق م. سے ہوئی یہ Bronze Age یا کانسے کا زمانہ کہلاتا تھا۔ یعنی تقریباً چار ہزار پہلے کے انسانوں نے منہ سے بولے ہوئے الفاظ کو تحریری شکل دینے کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے محسوس کرلیا کہ تحریر کیے ہوئے الفاظ پڑھ کر مختلف زبانیں بولنے والے اشخاص بھی پڑھ کر مطلب سمجھ سکتے تھے۔

تحریر کی ایجاد سے قبل مختلف علاقوں میں مختلف طریقے استعمال کیے جانے لگے تھے۔ مثلاً وہ یادداشت کے لیے یا کوئی پیغام کسی دوسری جگہ تک پہنچانے کے لیے لکڑی کے ٹکڑوں پر کسی اوزار سے نشان لگاتے تھے۔ یہ نشان ان کے الفاظ کی نمائندگی کرتے تھے۔ کچھ لوگ رنگین ڈوریوں یا رسیوں کے ذریعے پیغامات بھیجتے تھے اور کچھ لوگ ڈوریوں میں گرہیں باندھ کر اپنا مفہوم سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ امریکہ کے ریڈ انڈین دھوئیں کے ذریعے اپنے پیغامات دوردراز بسے ہوئے قبیلوں تک پہنچاتے تھے۔ وہ اس مقصد کے لیے آگ جلا کر دھواں پیدا کرتے تھے پھر کچھ لوگ دھوئیں پر چادر تان کر کھڑے ہوجاتے تھے اور وقفے وقفے سے چادر ہٹا کر دھواں چھوڑتے رہتے

تھے۔ آخر کار مصر میں سب سے پہلے تصویری زبان کا رواج شروع ہوا جسے ''ہیروغلیفی'' (Hieroglyphy) کہا جاتا ہے۔ اس تحریر میں کسی مٹی یا لکڑی کی تختی پر تصویریں بنا کر اپنا مفہوم تحریر کیا جاتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بابل میں بسنے والے سمیرین لوگوں اور مصری لوگوں نے مل کر تحریر کو تصویری شکل دینی شروع کی۔ وہیں سے یہ تحریر ایشیا اور دوسرے ملکوں تک پہنچی۔ لیکن چینی لوگوں نے اپنی تصویری تحریر الگ بنائی، وہ مصری ہیروغلیفی سے ملتی جلتی ضرور تھی لیکن بالکل الگ تھی۔ چین میں آج تک اسی تصویری تحریر سے کام لیا جاتا ہے۔ چینی زبان کا ہر کیرکٹر صرف حروف یا الفاظ ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ بابل اور نینوا میں بسنے والے سمیرین اور فونیشین باشندوں نے مصری ہیروغلیفی کی مدد سے الگ الگ ''حروف'' کی شکل بنانا شروع کیا۔

یونانی باشندوں نے فونیشین لوگوں سے سمیٹک (Semtic) سمیٹک حروف ابجد سیکھے۔ یونانی زبان کا پہلا حرف "Alpha" یا ''الف'' بیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شروع میں بیل کا منہ بنا کر اس لفظ کو سمجھایا جاتا تھا بعد میں الفا کا پہلا حرف A اسی لفظ سے بنایا گیا۔ اگر ہم موجودہ دور کی وسط ایشیا کی تحریروں پر غور کریں تو عربی زبان کا الف (ا) بھی انگریزی کے A کی شکل کی طرح محسوس ہوتا ہے اسی طرح یونانی زبان کے لفظ Bita سے انگریزی کا لفظ B وجود میں آیا۔

یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ گاؤں، قصبے اور شہر آباد ہو جانے کے بعد لوگوں نے اپنی اپنی الگ زبانیں بنائی تھیں لیکن جب تک تحریر ایجاد نہیں ہوئی تب تک لوگوں کو ماضی کے واقعات یا گیت وغیرہ یاد رکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے دولت مند لوگوں کے یہاں ایک زندہ لائبریری ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی دولت مند کوئی بڑی دعوت کرتا تو اس کے احباب فرمائش کرتے کہ وہ فلاں گیت سننا چاہتے ہیں یا فلاں کہانی سننا چاہتے ہیں۔ دولت مند شخص فوراً اپنے غلام کو حکم دیتا کہ ''لومڑی اور شیر'' کی کہانی کی کتاب لاؤ۔ فوراً ہی ایک غلام حاضر ہو جاتا جسے وہ کہانی زبانی یاد ہوتی تھی اور مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے داستان گو کی طرح وہ کہانی سنانے لگتا۔ یعنی اس زمانے کے تمام گیت، حادثوں یا جنگوں کے واقعات کسی غلام کو ازبر کرا دیے جاتے تھے اور وہ غلام کتاب کا کام دیتے تھے یعنی حکم ملنے پر اپنے آقا کے مہمانوں کی تفریح کا سامان کرتے تھے۔

یہاں ابتدائی دور کی تصویری تحریر کا ایک نمونہ پیش ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں ریڈ انڈین کے مائک میک (Micmac) نام کے قبیلے کے لوگ یہ تختی بنا کر ایک درخت پر لٹکا کر چلے گئے تھے تاکہ قبیلے کے سبھی لوگ خطرے سے آگاہ ہو سکیں۔

اس تصویر میں بائیں جانب دس نشان ظاہر کرتے ہیں کہ دشمنوں کے دس آدمی کدھر جا رہے ہیں۔ یہ خبر کشتی چلانے والوں نے دی ہے جو ایک مچھلی کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس سے آگے تیر کا نشان اس جھیل کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ دشمنوں کے دس آدمی کس طرف آ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ کشتی میں بیٹھے جو لوگ مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ انھوں نے دشمنوں کے دس آدمیوں کو جھیل کی طرف آتے دیکھا اور خطرے کی خبر دینے کے لیے یہ تختی بنا کر ایک درخت پر ٹانگ کر چلے گئے۔

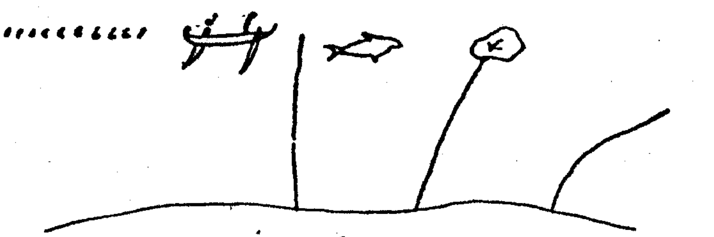

(تصویر اور واقعہ ہسٹری آف لینگویج سے لیا گیا ہے)

یہ قدیم ریڈ انڈین کی تصویری تحریر کا ایک نمونہ ہے۔ اس طرح پوری دنیا میں پہلے الگ الگ لوگوں نے اپنے اپنے طور پر تصویری تحریریں ایجاد کر کے پیغام بھیجنے یا دوسروں کے لیے پیغامات چھوڑنے کا طریقہ نکال لیا تھا۔ ذیل میں مصری تصویری تحریر ہیروغلیفی کا ایک نمونہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ وقت کے ساتھ کس طرح تصویریں بدلتی گئیں۔

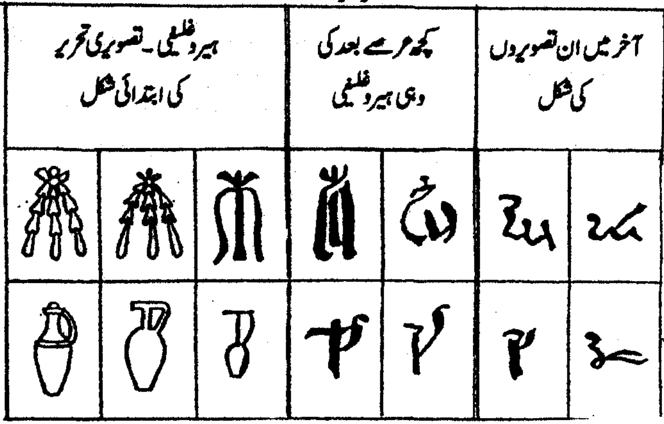

(ہیروغلیفی کے تین دور)

نیچے ہیروغلیفی تصویروں کے نام اور وقت کے ساتھ ان کی بدلتی شکلیں ملاحظہ کیجیے۔

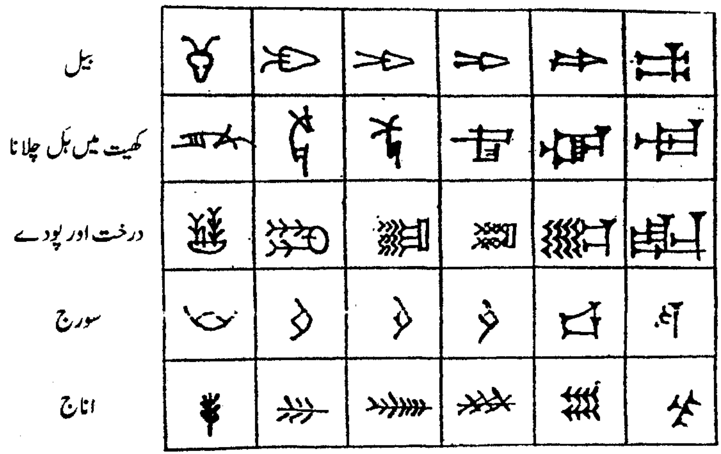

وقت کے ساتھ ساتھ ہیروغلیفی میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں اور آخرکار ان تصویروں نے حروف کی شکل لے لی جس سے مختلف تحریریں وجود میں آئیں۔ ان تصویروں نے حروف کی شکل کیسے لی اس کے لیے ذیل کا چارٹ ملاحظہ فرمائیے۔

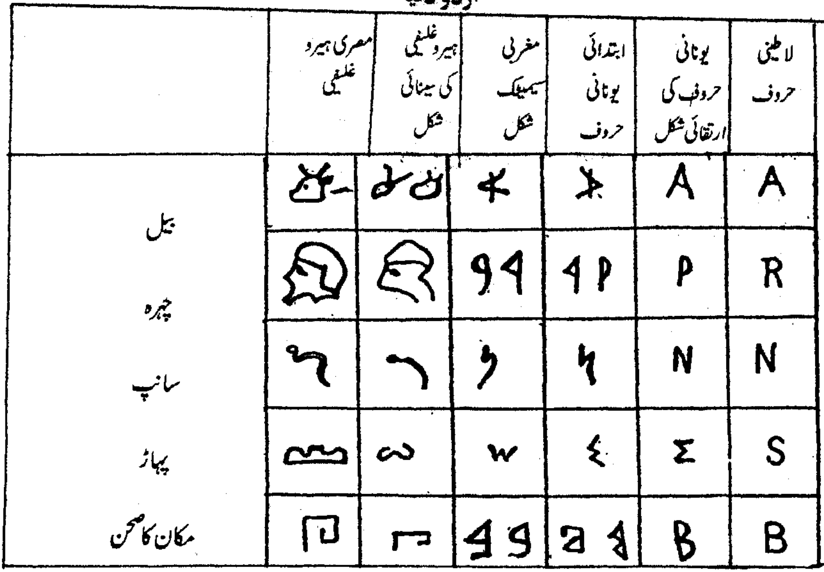

یونانیوں نے سیمیٹک حروف ابجد فونیشین سے سیکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تحریر کے دو مختلف اسلوب (ڈیزائن) ایک ساتھ ارتقا کی منزل میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک اسلوب جنوبی سیمیٹک تھا جو آج بھی کچھ تبدیل شدہ شکل میں ایتھوپین علاقوں میں مروج ہے۔ دوسری تحریر شمالی سیمیٹک کہلائی جو فونیشین، ہیبرو اور آرامک تحریروں کی شکل میں ابھری۔ یہی فونیشین تحریر ایشیا اور یورپ یعنی یورپ سے لے کر ہندستان تک کی تحریروں کا ماخذ ہے۔ تمام یورپین، عربی اور سنسکرت تحریریں ایک ہی ماخذ سے نکلی ہیں۔ اس لیے ان کے بہت سے حروف ابجد میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ زمانے کے ساتھ ان میں ایسی تبدیلیاں آتی گئیں کہ اب وہ بالکل مختلف محسوس ہوتے ہیں مثلاً عربی کا الف سنسکرت میں ایک سیدھے ڈنڈے کی شکل میں ہے۔ کسی لفظ کے درمیان وہ سیدھا لکھا جاتا ہے جیسے بھاگ (भाग) میں، البتہ شروع میں اس ڈنڈے کے ساتھ (अ) لگا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کی 'ی' ہندی کی (य) سے بہت مشابہ ہے۔ سنسکرت چونکہ بائیں طرف سے لکھی جاتی ہے اس لیے وہ 'ی' کی الٹی شکل نظر آتی ہے۔ عربی حرف ''ج'' ہندی کے (ज) سے مشابہ ہے سنسکرت میں چونکہ حروف کے ساتھ 'ا' کا استعمال ہوتا ہے اس لیے الفاظ کی مشابہت ختم ہوجاتی ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں میں صرف چینی اور جاپانی زبانوں کا ماخذ الگ ہے اس لیے وہ مغرب کی زبانوں سے مختلف ہیں۔

□□□

Y-5, D.D.A. Colony,
New Ranjeet Nagar,
New Delhi-110008

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے — ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کردیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

تحریر: این. گوپال راج
ترجمہ: پرویز احمد اعظمی

طلبہ کے لیے ایک سیٹلائٹ

دنیا میں پہلی بار سیٹلائٹ کے ذریعے راست ٹی.وی. نشریات سے آموزشی پروگرام دور دراز کے گاؤوں تک پہنچانے کے عمل کے تقریباً تین دہائی بعد ہندستانی خلائی تحقیق ادارے (ISRO) نے Edusat خلا میں روانہ کیا ہے۔ توقع ہے کہ اس سیٹلائٹ سے اعلا معیار کے پروگرام نشر کیے جاسکیں گے، جس سے ابتدائی سے پیشہ ورانہ نصاب تک ہر سطح کے تعلیمی امور میں مدد ملے گی۔

ISRO کے چیئرمین جی مادھون نائر نے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "Edusat اپنی طرز کا واحد سیٹلائٹ ہے جو پوری طرح سے تعلیمی خدمات کی فراہمی کے لیے وقف ہے۔"

بھارتی خلائی پروگرام کے بانی وکرم سارا بھائی نے پہلے سے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک بڑے ملک میں گاؤوں تک اطلاع پہنچانے کے لیے سیٹلائٹ پر جو خرچ آئے گا اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہوسکے گا۔ 1975 اور 1976 کے دوران ISRO نے تجرباتی سیٹلائٹ آموزشی ٹی.وی. (SITE) پروگرام جو کہ صحت، حفظانِ صحت اور خاندانی منصوبہ بندی پر مبنی تھے، 2400 گاؤوں میں نشر کیا تھا۔ ان گاؤوں کو راست وصولیابی کیونٹی ٹی.وی. سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام امریکہ کے خلائی مرکز نیشنل ایروناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (NASA) سے مستعار لیے گئے سیٹلائٹ کے ذریعے نشر کیا گیا تھا۔

بعد میں، ISRO نے اس کی جگہ اپنے INSAT Satellite کے ذریعے مختلف قسم کے تعلیمی پروگرام نشر کرنے شروع کیے۔ ISRO نے فاصلاتی تعلیم اور تربیت کے میدان میں بھی پروجیکٹ شروع کیے ہیں۔ تربیت اور ترقیاتی ترسیلی چینل (TDCC) کا استعمال کئی ریاستی سرکاریں کررہی ہیں۔ جس کا آغاز فروری 1995 میں گاؤں اور ضلعی عملے کی تربیت کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس چینل کا استعمال مختلف ادارے پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنے کے لیے بھی کررہے ہیں۔ آندھرا پردیش حکومت نے عملے کی تربیت اور ان سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے خود اپنا ایک چینل شروع کیا ہے۔ مدھیہ پردیش حکومت نے جھبوا ترقیاتی ترسیلی پروجیکٹ کو مسلسل برقرار رکھا ہے، جس کی ابتدا نومبر 1996 میں ریاست کے جھبوا اور دیگر پچھڑے اضلاع کے گاؤوں کو باہم ترقیاتی پروگرام فراہم کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اسکول اور کالج کے طلبہ تک تعلیمی ٹی.وی. پروگرام پہنچانے کے لیے بھی مصنوعی سیاروں کا استعمال کیا جارہا ہے۔ ایجوسیٹ کے عمل میں آجانے کے بعد یہ تمام ترقیاتی اور تعلیمی چینل اسی پر منتقل کردیے جائیں گے۔

ایجوسیٹ کم از کم سات سال خدمت فراہم کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے، جو پانچ مرتکز شعاعوں (Spot Beams) کے ذریعے ملک کے شمالی، شمال مشرقی، مشرقی، جنوبی اور مغربی خطوں کا احاطہ کرے گا۔ یہ لاسلکی شعاعیں (Radio Frequencies) استعمال کریں گی جنھیں عام طور سے Ku-band کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قومی سطح پر کوریج کے لیے بھی ایک Ku-band beam کا استعمال کیا جائے گا۔ Ku-band ریڈیو سگنل کے ذریعے نشر کیے جائیں گے بالخصوص مرتکز شعاعیں جو Edusat کے INSAT-3B کے Ku-band سے کئی گنا طاقتور ہیں۔ اسپیس ایپلیکیشن سینٹر، اسرو، احمد آباد کے ڈائرکٹر کے.این. شنکر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے سگنل چھوٹے سیٹلائٹ ڈش سے بھی وصول کیے جاسکیں گے اور اس کے نتیجے میں وصولیابی ٹرمنل سستے ہوجائیں گے۔

اسرو کی اطلاع کے مطابق "ایجوسیٹ کا بنیادی مقصد اسکولوں، کالجوں اور اعلا تعلیمی اداروں تک ترسیلی رسائی بہم پہنچانا ہے اور ترقیاتی ترسیلات کے ساتھ ساتھ غیر رسمی تعلیم کو تعاون فراہم کرنا ہے۔" اسرو پہلے منصوبے کی ترسیل کے لیے، وشویشریا ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی، کرناٹک، یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی اور راجیو گاندھی ٹیکنیکل یونیورسٹی مدھیہ پردیش کے ساتھ مل کر، ایجوسیٹ کی تیاری کے لیے، پچھلے سال سے ہی INSAT-3B کا استعمال کررہا ہے۔ ہر یونیورسٹی نے ایک اسٹوڈیو فراہم کیا ہے جہاں کلاسیں لگیں گی۔ استاد اپنے لکچر کو موثر بنانے کے لیے بلیک بورڈ کے ساتھ ساتھ Power point Presentation کا بھی استعمال کرسکے گا۔ لکچر کو براہِ راست فلما کر مصنوعی سیارے سے جوڑ دیا جائے گا جسے بعد میں زمینی ٹرمنل کو ترسیل کیا جائے گا۔

کالجوں کو دو قسم کے وصولیابی آلات فراہم کیے گئے ہیں۔

Non-Interactive وصولیابی آلہ تمام سمعی۔ بصری مواد کے ساتھ

گفت وشنید کی وصولیابی کرے گا۔ لیکن طلبہ کی طرف سے آنے والے سوالات استاد تک متبادل ذرائع جیسے ٹیلیفون، ایس.ایم.ایس، فیکس یا ای میل کے ذریعے ہی ارسال کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ Interactive terminals سوالات دریافت کرنے کے لیے طلبہ کو Voice Channel مہیا کرائیں گے۔

وشویشریا ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی، جس کے کرناٹک میں 118 انجینئرنگ کالج ہیں اور جن سے ایک لاکھ تیس ہزار طلبہ وابستہ ہیں، اس کے وائس چانسلر کے.بلویرا ریڈی کے مطابق "ایجوسیٹ اساتذہ کی تعداد میں کمی لانے کے سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوگا بالخصوص ٹیکنالوجی کے نمایاں میدانوں میں۔" ان کالجوں میں سے 100 کو پہلے دور میں وصولیابی ٹرمنل (Reception Terminals) فراہم کیے گئے ہیں؛ ان میں سے نصف کو Interactive Systems اور بقیہ کو Non-Interactive Sets سے جوڑا گیا ہے۔ ڈاکٹر ریڈی کا کہنا ہے کہ آزمائشی پروگرام کا طلبہ کی طرف سے، بالخصوص دور دراز کے انجینئرنگ کالجوں کا ردِعمل اچھا رہا ہے۔ تکنیکی پروگراموں کے علاوہ یونیورسٹی "Soft Skills" پروگرام بھی مصنوعی سیارے کی مدد سے چلا سکتی ہے۔ جیسے Leadership Training Techno-Entrepreneurship and career planning, جہاں طلبہ کو اپنے ہمسروں سے مقابلے میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ وی.ٹی. یونیورسٹی کے ای لرننگ مرکز کے صدر جی.ایل. شنکر کہتے ہیں کہ 100 کالجوں میں وصولیابی ٹرمنل (Reception Terminal) کے ذریعے ایک لیکچرر 10,000 طلبہ تک بیک وقت کئی صوبوں میں اپنی رسائی قائم کر سکے گا۔ اس لیکچر کو ایک کمپیوٹر فائل کی طرح محفوظ کیا جاسکتا ہے جسے طلبہ کبھی بھی دیکھ سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اسے سی ڈی. پر مہیا کیا جاسکے گا۔ انھوں نے دی ہندو کو بتایا کہ "پروگرام تیار کرنے کے لیے ہم کالج کے بہترین اساتذہ کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی خدمات کا استعمال کیا جاسکے۔" وی.ٹی. یونیورسٹی کی کوشش ہے کہ بڑی آئی.ٹی. کمپنیوں کو اس سے جوڑا جائے تاکہ طلبہ کو جدید ترین تکنیکی موضوعات سے روشناس کرایا جاسکے۔ کیمپس بھرتی اور گفت وشنید کے لیے کمپنیاں اس نیٹ ورک کا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر شنکر کے مطابق پہلا دور مختلف تکنیکی مسائل اور عملی مسائل کے حل کرنے میں بہت سود مند رہا۔ انھوں نے کہا کہ INSAT-3B کے ذریعے وی.ٹی. یونیورسٹی پہلے ہی لکچر کا ایک پورا سمسٹر Live چلا چکی ہے اور ایجوسیٹ کے عمل میں آجانے پر یہ سبھی پروگرام اسی پر منتقل کر دیے جائیں گے۔

ایجوسیٹ کے استعمال اور مستقبل کے بارے میں YCMOU کے وائس چانسلر چنڈت پالانڈے بھی ویسے ہی پرجوش اور پرامید ہیں۔ اس اوپن یونیورسٹی میں طلبہ کی مجموعی تعداد سات لاکھ سے زیادہ ہے، جس میں ہر سال ایک لاکھ بیس ہزار نئے طلبہ داخلہ لیتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی 1,455 مراکز چلا رہی ہے۔ وی.ٹی. یونیورسٹی ہی کی طرح وائی سی ایم اوپن یونیورسٹی کو بھی سو ریسپشن ٹرمنل فراہم کیے گئے ہیں۔ پالانڈے نے بتایا کہ تجربے کے دوران طلبہ کا ردِعمل بہت زبردست تھا۔ ایسے اچھے اساتذہ کا ملنا جو دور دراز کے علاقوں میں جاکر پڑھا سکیں، نہایت مشکل امر تھا۔ مصنوعی سیارے کے ذریعے مضمون کے ماہرین یونیورسٹی کے صدر دفتر، ناسک آکر اپنا لکچر دیں گے اور ملک کے ہر گوشے کے طلبہ اس سے مستفید ہوں گے۔ انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ لکچر کو مقامی کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا جائے گا اور وہ طالب علم جو لکچر کے وقت حاضر نہیں ہوں گے اسے پھر سے چلا کر دیکھ سکیں گے۔

ایجوسیٹ جیسے ہی ایک بار سرگرمِ کار ہوا ویسے ہی یہ پروجیکٹ نصف عمل آوری کے مرحلے میں داخل ہوجائے گا۔ اسرو کے مطابق: پانچ سو مرتکز شعاعوں (Spot-Beams) میں ہر ایک سے 100 سے 200 کلاس روم کو جوڑے جانے کا ارادہ ہے، جس سے ایک اندازے کے مطابق تقریباً 50,000 طلبہ تک تعلیمی پروگرام کی فراہمی کی جاسکے گی۔ اسرو، صدر دفتر کے سیٹلائٹ کمیونیکیشن کے ڈائرکٹر بھاسکر نارائن کے مطابق کئی صوبے اور تعلیمی اداروں نے بشمول یونیورسٹیوں کے، تعلیمی پروگرام فراہم کرنے کے لیے ایجوسیٹ کے استعمال میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔

ایجوسیٹ کو استعمال کرنے، اس کی کارکردگی کا فائدہ اٹھانے کے لیے اسرو نے علاقائی ورکشاپ منعقد کیے جس سے ایجوسیٹ کو مقبول بنانے اور تعلیمی ادارے اس کی اہلیت کا فائدہ کیسے اٹھائیں، اس بات کو مشتہر کیا گیا۔ اس کے لیے تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی ایک کانفرنس اسی سال جولائی میں منعقد کی گئی تھی۔

اسرو کے صدر دفتر میں ایجوسیٹ کے مشیر ایس. پربھاکرن نے وثوق سے کہا کہ اس سے اسکولی تعلیم کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ کرناٹک کے ضلع چراج نگر کے تقریباً 900 پرائمری اسکولوں کو وصولیابی ٹرمنل سے جوڑا گیا ہے۔ ان کے لیے کرناٹک حکومت کے شعبۂ ریاستی تعلیم، تحقیق اور تربیت (DSERT) نے پروگرام تیار کیے ہیں، جنھیں جلد ہی ترسیل کیا جائے گا۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو ایجوسیٹ کے ذریعے بہتر بنانے کے لیے ایک خاکہ تیار کر رہی ہے۔ پربھاکرن نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ سیٹلائٹ سسٹم کا استعمال نہ صرف طلبہ کو پروگرام فراہم کرنے کے لیے کیا جائے گا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی تربیت کے لیے بھی کیا جاسکے گا۔

ایجوسیٹ کی نصف عمل آوری کا دور تقریباً دو سال چلے گا۔ پوری طرح سے عمل میں آنے کے بعد امید ہے کہ ایک لاکھ پچاس ہزار وصولیابی ٹرمنل اس سے تعاون حاصل کریں گے۔ بھاسکر نارائن نے کہا کہ "ہمیں امید ہے کہ ہر صوبہ ایک یا ایک سے زائد مراکز قائم کرے گا۔" اپنی بات کی مزید صراحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کلاس کی ساعتوں کے بعد نیٹ ورک کا استعمال انٹرنیٹ کے ذریعے مواد حاصل کرنے کے لیے کیا جاسکے گا۔

جبکہ پہلے دور میں اِسرو استعمال کنندگان کو وصولیابی ٹرمنل فراہم کرنے میں مدد کررہا ہے۔ استعمال کنندگان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کے عمل پیرا ہونے پر انھیں اس کی لاگت ادا کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ پہلے دور سے یہ ظاہر ہوا کہ کم خرچ پر اس سے اچھا مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دی.ئی. یونیورسٹی نے فوری طور سے اندازہ لگایا ہے کہ ایک مضمون کے ایک سمسٹر کا احاطہ کرنے میں 30 گھنٹے کا مواد تیار کرنے پر تین سے چار لاکھ روپے کا خرچ آئے گا۔ ڈاکٹر پالانڈے کا خیال ہے کہ ایک سال کا مواد تیار کرنے کے لیے یونیورسٹی کو دو کروڑ پچاس لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر ریڈی نے بتایا کہ "اخراجات کی بھرپائی کے لیے ہم طلبہ سے ایک معمولی رقم وصول کریں گے۔" اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "ایسا تبھی ممکن ہوسکے گا جبکہ یونیورسٹی تمام مضامین میں پروگرام مہیا کرانے میں کامیاب ہوجائے گی۔

دی.ئی. یونیورسٹی کو اس بات کی بھی امید ہے کہ وہ اپنے پروگرام کو فروخت کر کے آمدنی بھی حاصل کرسکے گی۔ ڈاکٹر پالانڈے کے مطابق وائی سی ایم او یونیورسٹی کو سٹیلائٹ کے ذریعے فاصلاتی تعلیم فراہم کرنے پر آنے والے اخراجات کے لیے حکومت کا تعاون ضروری ہوگا۔

ہندستان کی سرحدوں کے پار بھی ایجوسیٹ سے فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔ مادھون نائر کے مطابق ایجوسیٹ دیگر جنوبی ایشیائی ممالک کا احاطہ جزوی یا کلی طور سے جس طرح کرے گا اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ان ممالک کو اس کا تعاون بھی دیا جاسکے گا۔

(بشکریہ "دی ہندو" دہلی، 22 ستمبر 2004)

□□□

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریک خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابرنامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

"تزکِ بابری" کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ترجمہ: عبدالعلیم قدوائی

جوہری توانائی کی فراہمی کا درخشاں منصوبہ

ہمارے ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے اس وقت بجلی کی توانائی کی پیداوار اور فراہمی بہت اہم مسئلہ ہے اور جوہری توانائی اس کا بڑا موثر اور طاقتور ذریعہ ہے۔ یہ بیک وقت تمام کام کرنے والے انسانوں زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور متنوع قسم کی خدمات کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ ملک کی انفرادی گھریلو پیداوار(Percapita gross domestic product)اور بجلی کے انفرادی صرفہ(Percapita Electricity Consumption) میں بڑا مضبوط اور گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ آبادی میں اضافے، قومی آمدنی وترقی کے رجحانات اور صنعت وحرفت و دیگر چیزوں میں بجلی کے استعمال کے بارے میں حکومت ہند کے جوہری توانائی کے محکمے(DAE) جس کو قائم ہوئے لگ بھگ پچاس برس ہو رہے ہیں، نے ایک تفصیلی جائزہ لیا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ آئندہ بیس برسوں میں بجلی کی پیداوار میں 6.3فی صد کے اضافے کی توقع ہے جس میں آئندہ بھی اضافہ ہوتا رہے گا، مگر اس کی شرح کم ہوتی جائے گی۔ 1947-48 میں ہندستان میں 4.1بلین کیلو واٹ بجلی پیدا کی جاتی تھی جو2002-03 میں بڑھ کر 600بلین کیلو واٹ ہوگئی ہے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پچاس برس کے بعد ملک میں بجلی کا انفرادی صرفہ 5300 کیلو واٹ سالانہ تک پہنچ جائے گا اور ملک میں بجلی کی پیداوار بڑھ کر 8000بلین کیلو واٹ ہو جائے گی۔ پچھلے ریکارڈ کے پیش نظر یہ توقع ہے کہ مستقبل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ نشانہ تبدیل شدہ الکٹریسیٹی ایکٹ 2003 کے تحت حاصل کر لیا جائے گا بشرطیکہ ملک میں موجود تمام وسائل کا منصفانہ استعمال کیا جائے۔ اس کام میں نیوکلیر توانائی کا اہم کردار رہے گا جو ہندستان جیسے زیادہ آبادی اور محدود ایندھن رکھنے والے ملک کے لیے لازمی ہے۔

ملک میں توانائی کی فراہمی کے لیے نیوکلیر توانائی کی اہمیت کو آج سے پچاس سال قبل ہی تسلیم کر لیا گیا تھا اور اسی مقصد کے کے تحت جوہری توانائی کا محکمہ قائم کیا گیا جو نیوکلیر ایندھن اور دوسرے وسائل سے بجلی پیدا کرنے کے وسیع تر منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ملک میں یورینیم تو محدود مقدار میں ہے مگر تھوریم خاصی مقدار میں مل سکتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں اس توانائی کا 33فی صد حصہ خوش قسمتی سے ہندستان میں پایا جاتا ہے۔

نیچرل یورینیم میں یورینیم235اور یورینیم238دونوں موجود ہوتی ہیں مگر تنہا یورینیم238 کی مدد سے ایٹمی ری ایکٹر کو نہیں چلایا جا سکتا اس کے لیے اسے پلوٹونیم 239 میں بدلنا پڑتا ہے۔ نیوکلیری ری ایکٹر سے نکلنے والا ایندھن دو طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اوپن سائیکل میں توانائی ایندھن ایک ہی دفعہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور استعمال شدہ ایندھن میں تھوڑی مقدار میں توانائی بچ جاتی ہے۔ مگر بند سائیکل طریقہ میں استعمال شدہ ایندھن سے پلوٹونیم اور یورینیم 238 کو پھر سے حاصل کر لیا جاتا ہے اور تیز چلنے والے ری ایکٹروں میں ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح توانائی کے خاصے حصے کو دوبارہ کام میں لے آیا جاتا ہے۔ جو ری ایکٹر تھوریم ہی سے چلائے جاتے ہیں وہاں بند سائیکل طریقہ استعمال کرنا لازمی ہے۔ اسی سے پھر یورینیم 233 نکالی جاتی ہے۔ نیوکلیر توانائی کا یہ مفید پروگرام ہمارے ملک کے مایہ ناز سائنس داں ہومی جہاں گیر بھابھا کی دین ہے جنھیں ملک میں جوہری توانائی کا بانی کہا جاتا ہے۔

اس منصوبے کے پہلے مرحلے میں پریشرائزڈ ہیوی واٹر ری ایکٹرس(PHWR) جن میں ایندھن کے سائیکلنگ کی سہولتیں موجود ہوتی ہیں، لگائے جاتے ہیں۔ یہ پورا کام صنعتی زمرے میں آتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں 12پی ایچ ڈبلیو آر کام کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے 1962 میں مہاراشٹر میں تارا پور میں دو بوائلنگ واٹر ری ایکٹروں (BWR) لگا کر اس پروگرام کا افتتاح کیا گیا تھا۔ ان 14 ایٹمی ری ایکٹروں کی پیداواری صلاحیت 2770 بلین واٹ ہے۔ ان ری ایکٹروں کا ڈیزائن بڑے غور وخوض کے بعد ملکی ضروریات، غیر ملکی تجربے اور مختلف احتیاطی و حفاظتی تدبیروں کے ساتھ تیار کیا گیا ہے اور وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ یہ کام نیوکلیر پاور کارپوریشن(NPC) جو جوہری توانائی محکمے کا ضمنی پبلک سیکٹر یونٹ ہے کے سپرد ہے۔ جسے ماحول میں ریڈیو ایکٹیوٹی منتشر کرنے کا 200ری ایکٹر سال کا تجربہ موجود ہے۔ ہندستانی پی ایچ ڈبلیو آر دنیا میں بہترین قسم کے ری ایکٹر مانے جاتے ہیں۔

اس وقت ہندستان کے مختلف حصوں میں 6پی ایچ ڈبلیو آر زیر تعمیر ہیں۔ ایک ہزار واٹ کی پیداواری صلاحیت والے 2 ہلکے ری ایکٹر

LWR تامل ناڈو میں روس کے اشتراک سے کونڈانکولم کے مقام پر بن رہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ 2020 تک ہمارے ملک میں 200000 ملین واٹ بنانے کی نیوکلیر صلاحیت ہو جائے گی۔

دوسرے مرحلے میں فاسٹ بریڈر ری ایکٹر جن میں ری پروسیسنگ پلانٹ اور پلوٹونیم سے حاصل شدہ ایندھن تیار کرنے کے پلانٹ شامل ہیں، لگائے جاتے ہیں۔ 1985 سے کلپاکم (تامل ناڈو) میں اندرا گاندھی سینٹر فار اٹامک ریسرچ کام کر رہا ہے جہاں 400 ملین واٹ کا دیسی ایف بی ٹی آر یورینیم 238 اور پلوٹونیم کا رہائڈ ایندھن کی مدد سے چل رہا ہے۔ اس تجربے سے مطمئن ہو کر جوہری توانائی کے محکمے نے اس ٹیکنالوجی کا ایک بڑا پروگرام مرتب کیا ہے جس میں کئی ملے جلے آکسائڈ تیار کرنے والے ایف بی آر قائم کیے جائیں گے۔ ستمبر 2003 میں حکومت نے 500 ملین واٹ کا پروٹو ٹائپ فاسٹ بریڈر ری ایکٹر بنانے کی منظوری دی ہے جس کو بھارتیہ نابھکیہ ودھت نگم (BHAVINI) عملی شکل دے گا۔ اس کے بعد آنے والے برسوں میں دھاتوں سے بنے ایندھن سے چلنے والے ایف بی آر قائم کیے جائیں گے جن سے جوہری توانائی کی پیداوار میں قابل ذکر اضافہ ہوگا اور بجلی کے بحران پر خاطر خواہ قابو پایا جا سکے گا۔

توانائی کا تیسرا اور آخری مرحلہ تھوریم۔ یورینیم 233 کی سائیکل پر مبنی ہے۔ ایندھن کی دستیابی کے ساتھ ہی ہندستان کی گنجان آبادی کے پیش نظر اس پروگرام میں حفاظتی اور احتیاطی تدابیر کے متعلق تحقیق بہت ضروری ہے، اسی لیے جوہری توانائی کے محکمے نے فاسٹ بریڈرس کو لگانے اور پھیلانے کے پروگرام پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس طرح سے نیوکلیر ٹیکنالوجی کے میدان میں ہندستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔

بشکریہ "انڈیا ٹوڈے" مورخہ 23 راگست 2004

□□□

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر کے بھٹناگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف اوّل تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45 روپے

سخنورانِ گجرات

مرتب: سیّد ظہیرالدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77 روپے

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157 روپے

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی

"قطب مشتری" اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی کے متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48 روپے

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شمیر عباسی

گپت سلطنت

کنشک کی موت کے چند برسوں بعد، ہون قبائل نے یوچی قبائل کا تعاقب کیا۔ ان کی تباہ کاریوں اور لوٹ مار کو تاریخ کے سب سے بڑے انتقام کا ایک حصہ مانا جاتا ہے۔ جس سلطنت نے اس انتقام کو کچلنے میں اہم رول ادا کیا اسے گپت سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا آغاز چندر گپت سے ہوا جو 320 عیسوی میں مگدھ کے تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس نے ایک لچھوی شہزادی سے شادی کی، جو ایک دوسری قدیم ریاست تھی۔ اس نے ایک بڑی سلطنت قائم کی جس میں کوشل بھی شامل تھا۔ اس کے بیٹے سمدر گپت نے اپنی پوری زندگی فوجی معرکوں میں گزاری اور سلطنت کو آسام سے لے کر شمال میں پنجاب تک پھیلا دیا۔ اس نے مشرق سے لے کر مغرب ،جنوب اور کانچی تک کئی فتوحات حاصل کیں۔ اس نے نو راجاؤں کو یا تو شکست دی یا ان کی سلطنت کو نیست و نابود کر دیا اور سرحد کی متعدد سلطنتوں کو اپنے زیر نگیں کر کے انھیں اپنا اسامی بنا لیا۔ وہ ''سو جنگوں کا ہیرو'' تھا اور اسے ''ہندستان کا نیپولین'' کہا جاتا تھا۔ اس کے مزارعین میں پنجاب اور اجین کے طاقتور شاکا اور کشان حکمراں شامل تھے جنھیں ایک حد تک خود مختاری حاصل تھی لیکن وہ اسے تعظیم دیتے تھے اور محصول ادا کرتے تھے۔ اور یہ اسی سمدر گپت کا بیٹا چندر گپت ثانی تھا جو بعض وجوہات کی بنا پر اس سلطنت کا سب سے مشہور راجا قرار دیا گیا اور جسے وکرمادتیہ کا لقب حاصل ہوا۔ چندر گپت اور سمدر گپت کی حکومتوں میں جو کہ ایک صدی کی تین چوتھائیوں تک محیط تھیں، ایک بار پھر شمالی ہند میں سیاسی اتحاد دیکھنے کو ملا۔ اتحاد سے امن قائم ہوا۔ ملک نے ترقی حاصل کی اور کئی دوسری سلطنتوں کے لیے موجب رشک بن گیا۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں پائے گئے اس عہد کے متعدد سونے، چاندی، اور تانبے کے یونانی سکے ملک کی تونگری کا ثبوت ہیں۔ دہلی میں قطب مینار کے پاس مہرولی میں چندر گپت دوئم کے ذریعے بنائے گئے بے زنگ لوہے کے ستون سے اس عہد میں دھات کاری میں حاصل ہونے والی اعلا سطح کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فاہیان نے اس عہد میں لوگوں کی بہ افراط اور خوشحال زندگی کا ذکر کیا ہے جو چندر گپت ثانی کے عہد میں ہندستان آیا تھا۔

چندر گپت ثانی کے بعد کمار گپت تخت نشیں ہوا۔ اس نے اپنے دونوں پیش روؤں کے ذریعے بنائی گئی وسیع سلطنت کو برقرار رکھا اور اشومیگھ یگیہ کا انعقاد کیا۔ اس نے 40 برسوں تک حکومت کی حالانکہ اس کی حکومت کے آخری دنوں میں اس کی سلطنت کا امن و سکون منتشر ہو گیا تھا۔ خانگی دشمنوں کے علاوہ ہونوں کے ایک ساتھی قبیلے کی طرف سے بیرونی حملہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے ہندستان پر چڑھائی کر دی تھی اور اس عظیم سلطنت کے لیے ایک سنگین خطرہ بن گئے تھے۔ ہون قبیلے کا یہ حملہ یوچیوں (کشان) کے حملے سے مختلف تھا۔ حالانکہ ابتدائی منگولی گھوڑ سواروں کا قافلہ پہلی صدی عیسوی میں ہی یورپی روس کی مشرقی سرحدوں تک پہنچ گیا تھا، یہ پانچویں صدی عیسوی تھی جسے حقیقی طور پر ہونوں کی صدی کہا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے بہت سے جری جنگی سورماؤں کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ اور جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے یہ سلسلہ تین صدیوں تک چلتا رہا۔

سبھی دستیاب ثبوتوں کے مطابق، ہون اور ان کے تورانی ساتھی سب سے پہلے چینی سلطنت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس اقدام میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اب وہ مغرب کی طرف بڑھے۔ ایک شاخ نے، جسے سفید ہون (White Huns) کہا جاتا تھا، وادی آکسس (Oxus Valley) پر قبضہ کر لیا۔ وہ آگے بڑھے، ہندوکش کو عبور کیا اور قندھار کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اسی دوران انھوں نے گپت سلطنت کو بھی ایک زور دار دھکا دیا۔ اس بربریت کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ وحشی اور انتقامی ہونوں کی پیش قدمی نے بے حد ہولناک تباہیوں اور مکمل بربادیوں کے نشان چھوڑے۔ کمار گپت کے ولی عہد شہزادے اسکند گپت نے ہونوں کو پیچھے دھکیلا۔ لیکن ابھی وہ باپ کی موت کی خبر سن کر اپنے فتح یاب معرکے سے واپس ہی لوٹا تھا کہ غضبناک ہونوں کے دوسرے حملے سے سلطنت کی حفاظت کرنے کے لیے اسے دوبارہ بھاگنا پڑا۔

ہون جتھوں سے بعد کی لڑائی بے حد ہولناک تھی۔ لیکن بالآخر اسکند گپت ہونوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے اعزاز میں گیت لکھے۔ ہونوں پر اسکند گپت کی اس فتح کو دنیا کی تاریخ میں ایک اہم موڑ مانا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، اسکند گپت کے ذریعے ہونوں کو ملی شکست اتنی فیصلہ کن تھی کہ اگلی نصف صدی تک ہونوں نے گپت سلطنت میں خلل اندازی کرنے کی ہمت نہیں کی۔

باوجود اس کے، یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہونوں کے حملوں نے گپت سلطنت کے اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔ حلقہ بگوش سرداروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ ہون سردار، تورامن اور اس کے بیٹے مہرگلا کے علاوہ دوسروں نے بھی اپنے سر اٹھائے جس میں مالوا کے یشودھرمن، موکھری خاندان کے اتانورمن اور بنگال کے ساسنکا شامل تھے۔ در اصل، بعض مورخین کے مطابق، قدیم ہندستانی تاریخ کی

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔

جاگیردارانہ بالادستی حقیقت میں بعد کے گپت عہد کا حصہ تھی جو ہندستانی کلاسیکی دور کی امتیازی نشانی تھی۔ گپت انتظامیہ موریہ نظام کے نمونے پر بنی تھی یعنی صوبائی گورنر، سرحدی جاگیرداری اور حلقہ بگوش ریاستیں جن پر ماتحت راجاؤں کی حکومت ہوتی تھی۔

گپت سلطنت کا اقتدار مشرق میں بنگال سے لے کر مغرب میں کاٹھیاواڑ تک قائم تھا۔ جب کہ اس عہد میں ایک طرف چین ایک سخت آزمائش سے گزر رہا تھا تو دوسری طرف یونانی سلطنت اپنے زوال کی طرف مائل تھی، ہندستان ممکنہ طور پر دنیا کی سب سے تہذیب یافتہ جگہ تھی۔

چونکہ ملک کی خوشحالی صنعتی اور زراعتی ترقی پر منحصر تھی، یہ سلطنت کی ذمے داری تھی کہ وہ سینچائی کے لیے پانی مہیا کرے جیسا کہ سدرشن جھیل کے باندھوں کی مرمت سے ظاہر ہوتا ہے جو اسکند گپت کے دور میں کیا گیا۔

اس عہد کے ادبی کارناموں کی نظیر نہیں ملتی۔ اس عہد میں اٹھارہ پرانوں کو دوبارہ ترتیب دیا گیا، از سر نو لکھا گیا اور مدون کیا گیا۔ عظیم رزمیہ نظم مہا بھارت بھی از سر نو لکھی گئی جو کہ اس کی موجودہ شکل ہے۔ آرٹ اور سنگ تراشی کے میدان میں بھی کارنامے کم گراں قدر نہیں تھے۔

ہندو راجاؤں کا آدرش، وکرمادتیہ، کی روایت نے بھی گپتاؤں کے عہد میں جنم لیا۔ ان میں سے اکثر نے قابل فخر لقب اختیار کیا۔ جب کہ موریہ راجاؤں کے عہد میں ہندستان اور مشرق بعید کے درمیان تجارت اڑیسہ کے ساحلی بندرگاہوں کے ذریعے اور یورپ سے جنوبی ہند کے ساحلی بندرگاہوں سے ہوتا تھی۔ چندر گپت نے مغربی ساحلوں کے الحاق سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے بندرگاہوں کے ذریعے یورپ اور مشرق وسطی سے اپنے تجارتی تعلقات کو غیر معمولی فروغ دیا۔ مشرقی ساحلوں کے راستے جبل پور تک اور مغربی ساحلوں کے ذریعہ اجین، ناسک اور کروار تک، شمال و جنوبی ہندستان کے درمیان تجارت میں بھی اضافہ ہوا دوسرے الفاظ میں ان راستوں سے جن کو گپت فوجوں نے اختیار کیا تھا۔

ہندستانی تاریخ کے اس دور میں جسے ہم ما بعد گپت عہد کہتے ہیں تھانیسر کی ایک نمایاں شخصیت ہرش وردھن (606-647) بھی شامل تھا۔ اس نے اوائل عمری میں کافی پریشانیاں دیکھی تھیں۔ اس کے باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے سرسوتی کے کنارے پر خود کو جلا کر مار ڈالا۔ اس کے بڑے بھائی کو گودا کے راجا نے قتل کر دیا اور اس کی بہن کا شوہر جو قنوج کا لاولد راجا تھا، مالوا کے راجا کے ہاتھوں مارا گیا۔ جب کہ قنوج اور تھانیسر اس کی تخت نشینی کے لیے موجود تھے، ہرش غم و اندوہ سے گھرا ہوا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک سادھو کی طرح زندگی گزار دے۔ جب اس کے وزیروں نے اس سے تخت نشینی کی درخواست کی تو اس نے گنگا کے کنارے پر بنے۔ آلوکیتسور کے مجسمے کے پاس گیان حاصل کرنے اور اپنے آپ کو بدھ مت کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا وجدان حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں پر جو حالات سامنے آئے انھوں نے اسے تخت پر بیٹھنے کے لیے مجبور کر دیا۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو راجا یا مہاراج نہیں بلکہ صرف ایک ''راج پتر'' یا ''سلادتیہ'' سمجھتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر 16 برس کی تھی۔

اگلے چھتیس برسوں تک وہ اپنی سلطنت میں اتحاد اور امن و سکون قائم رکھنے کے لیے اپنے پڑوسیوں سے لڑائیاں کرتا رہا جنھوں نے اس کے خاندان کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔ وہ کامیاب ہوا اور اس کی سلطنت پورے شمالی ہند میں پھیل گئی جس میں گنگا اور ستلج کے درمیانی علاقے اور مالوا گجرات کاٹھیاواڑ، بنگال، متھلا، قنوج اور اڑیسہ شامل تھے۔

بعض معنوں میں، ہرش بالکل اشوک کی طرح تھا۔ اس نے کھانے کے لیے جانوروں کو مارنے پر پابندی لگا دی۔ اس نے بہت سارے کارہائے نمایاں انجام دے۔ اس نے دھرم شالائیں بنوائیں۔ غریبوں کے لیے کھانے اور دوائیوں کا انتظام کیا۔ عظیم چینی سیاح یوان چیانگ کے تذکروں سے بھی اس کے ثبوت ملتے ہیں جس نے 630 عیسوی سے 644 عیسوی تک ہندستان کا سفر کیا۔ ہرش نے اپنی اڑیسہ کی فتح سے لوٹنے کے بعد راج محل میں اس کا خیر مقدم کیا۔

یوان چیانگ کے ذریعے ہرش نے چینی بادشاہ کو قیمتی تحائف بھیجے اور اس کے ساتھ سیاسی تعلقات ہموار کیے جس نے اس کے بدلے میں روایتی تحائف ہرش کو بھیجے۔

ہرش تخلیق کاروں کا ایک بڑا مربی تھا۔ مشہور مصنف بان بھٹ اس کے دربار میں تھا اور اس نے 'ہرش چرت' کے نام سے ایک نامکمل تذکرہ تحریر کیا ہے جو اس کی مدح سرائی میں لکھا گیا تھا اس تذکرے میں اس کے عہد کی روز مرہ زندگی اور اس کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے۔ ہرش بذات خود بھی ایک قابل لحاظ مصنف تھا۔ تین ڈرامے رتناولی پریہ درشکا، اور ناگ نندا اس کے نام سے موسوم ہیں۔ اس بات میں مختلف رائے ہے کہ آیا ہرش ایک بودھ تھا یا شو کا ماننے والا۔ حالانکہ، اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ اشوک کی طرح یہ راجا بھی بے حد مذہبی تھا اور دونوں مذاہب کی تعظیم کرتا تھا۔ ہرش کے عہد میں محض انھی دو مذاہب کو نہیں بلکہ تمام مذاہب کو درباری سرپرستی حاصل تھی۔ یوان چیانگ کے مطابق، شاہی مہمان خانوں میں روزانہ کم از کم 1000 بودھ بھکشوؤں اور 500 برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

ہرش نالندا یونیورسٹی کا سرپرست تھا۔ اس نے ایک وہار بنوایا اور بدھ کا ایک کانسے کا مجسمہ لگوایا۔ اس نے گنگا کے کناروں پر کئی ہزار استوپ بھی بنوائے۔ یوان چیانگ کے اعزاز میں اس نے ایک عظیم مجلس کا انعقاد کیا جس میں نالندا سے ایک ہزار بھکشو اور تین ہزار جین اور برہمنوں نے شرکت کی۔ یوان چیانگ کو مجلس کا صدر مقرر کیا گیا۔ راجا کی لمبائی کے برابر بدھ کے ایک سونے کے مجسمے کو خاص طور سے بنوائے گئے ایک سو فٹ اونچے مینار میں نصب کیا گیا۔ اس مجلس کے اختتام کے بعد جو 25 دنوں تک جاری رہی، راجا نے پریاگ میں ایک اور مجلس منعقد کی جس میں اس نے اپنے تمام صوبے داروں کو بلوایا۔ یہ مجلس 75 دنوں تک چلی۔ پہلے دن بدھ کی پوجا کی گئی۔ دوسرے اور تیسرے دن سورج اور شو کی مورتیوں کی پوجا ہوئیں۔

646 عیسوی میں ہرش کی موت ہوئی۔ اس نے کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔ اس کے وزیروں میں سے ایک نے تخت شاہی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہندستان ایک تاریک عہد میں داخل ہوا، راجپوت سلطنتوں کا عہد جہاں ہر راجا اپنا مالک خود تھا۔

355, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi

□□□

سلام بن رزاق

چادر

وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا سامنے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سڑک دھوپ میں دور تک یوں چمک رہی تھی جیسے بہتی ہوئی نہر کو کسی نے جادو کے زور سے منجمد کر دیا ہو۔ شہر کی یہ وہی سڑک تھی جس پر دیر رات تک ٹریفک متواتر بہتی رہتی تھی اور صبح سے شام بلکہ نصف شب تک لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے رہتے تھے۔ موٹروں کی آوازوں اور لوگوں کے شور سے دونوں طرف فٹ پاتھوں پر صبح و شام میلے کا سا سماں رہتا تھا۔ مگر اُس وقت سڑک اور فٹ پاتھ دونوں ہی ویران تھے۔ نہ کوئی متنفس دکھائی دے رہا تھا، نہ کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اُس کا ذہن بھی تقریباً اس سڑک ہی کی طرح ویران ہو گیا تھا۔ البتہ اُس میں رہ رہ کر اندیشوں اور خدشات کے بگولے اٹھتے رہتے تھے۔ اُس کے اردگرد خوف اور مایوسی کی دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے پاس رکھی میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا ایک سگریٹ جلائی، گہرا کش لیا اور دھواں کھڑکی کے باہر خارج کر دیا۔ ہوا بھی رُکی ہوئی تھی۔ اُس کے منہ سے خارج ہونے والا دھواں ہوا میں دھیرے دھیرے یوں تحلیل ہو رہا تھا جیسے کسی جاں بلب مریض کی سانسیں آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہوں۔ اُسے اپنے گھر کی بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اُس کی نظروں کے سامنے بار بار سلمیٰ کا دلنواز چہرہ ساجد اور ماجد کی معصوم شرارتیں اور اپنی بوڑھی فالج زدہ ماں کی مشفقانہ آنکھیں گھوم جاتی تھیں۔ سلمیٰ نے گھر سے چلتے وقت دبی زبان سے کہا تھا۔

''ممبئی کے حالات ٹھیک نہیں۔ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

اُس نے سلمیٰ کو ڈھارس دلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''پریشان ہونے کی بات نہیں۔ ممبئی جیسے بڑے شہر میں ایسے چھوٹے موٹے دنگے تو آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہاں کی کاروباری زندگی پر ان کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔''

''مگر آپ دادر جانے کی بات کر رہے تھے۔ آج اخبار میں فساد زدہ علاقوں کے جو نام چھپے ہیں ان میں دادر کا بھی نام ہے۔''

''ارے بابا وِدّیا چرن بھی تو وہیں رہتا ہے۔ میں پہلے اُسی کے گھر جاؤں گا اور اُسی کے ساتھ پارٹی سے ملوں گا۔''

''مگر چار چھے روز بعد چلے جائیں تو کیا حرج ہے۔''

''تم نہیں سمجھتیں۔ وِدّیا نے کہا تھا، پارٹی جنوئن ہے۔ بھوانی پیٹھ میں جو سپر مارکیٹ بن رہا ہے اُسی پارٹی کا ہے۔ یہاں پونے کے دو تین انٹیریر ڈیکوریٹر پارٹی کے پیچھے پڑے ہیں مگر وِدّیا اس کا پورا کانٹریکٹ مجھے دلانا چاہتا ہے۔ وہ اُس کا چیف انجینئر ہے۔ لاکھوں کا کانٹریکٹ ہے۔ ایسا گولڈن چانس پھر نہیں ملے گا۔ معاملات طے ہوتے ہی میں فوراً دادر ہی سے بس لے کر شام تک واپس پونے آ جاؤں گا، تم فکر مت کرو۔''

سلمیٰ چپ تو ہو گئی تھی مگر اُس کے چہرے سے تردد کا غبار پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔

اُس نے سگریٹ کا ٹرا کھڑکی سے باہر اچھالا اور کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ چھت پر پنکھا گھٹی گھٹی آواز میں گھر گھرا رہا تھا جیسے کوئی کھُل کر کچھ کہنا چاہے مگر خوف سے کہہ نہ سکے۔ ہر چند وہ یہاں محفوظ تھا مگر رہ رہ کر اُس کے باطن میں بھی خوف کی لہریں اٹھتی رہتی تھیں۔ وِدّیا چرن، وِدّیا چرن کے پتا اُسے تسلی دیتے رہتے تھے۔ وِدّیا چرن کی ماں بھی اُسے دلاسا دیتی۔ چوکے پر وِدّیا چرن کی بیوی سُشما اور اُس کی بہن آرتی اصرار کر کر کے اُس کی تھالی میں پُوریاں اور سبزی پروستی رہتیں۔ وِدّیا چرن کا چھوٹا بھائی شیام اُسے بار بار کیرم کھیلنے کی آفر دیتا رہتا۔ غرض پورا گھر کا گھر اُس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ اس کے باوجود جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا اُس کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔

جس وقت وہ ایشیاڈ بس سے دادر پر اُترا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ اپنا چھوٹا سا بریف کیس لیے اُس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر اُسے آس پاس کوئی ٹیکسی دکھائی نہیں دی۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ اکثر دکانوں کے شٹرز گرے ہوئے تھے اور فٹ پاتھ پر اکا دکا لوگ چوکنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیزی سے آ جا رہے تھے جیسے انھیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہو، فضا میں عجیب سا تناؤ تھا۔ اُسے صبح چلتے وقت سلمیٰ کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی دل میں ایک نامعلوم اندیشے نے سر اُبھارا۔ مگر اُس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دے کر اُس اندیشے کو جھٹک دیا۔ اُس نے سوچا وِدّیا چرن کا گھر یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے پیدل ہی چلتے ہیں۔ دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ وہ بریف کیس لیے پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ بڑی سڑک کراس کر کے جب وہ ایک سب وے سے گزرنے لگا تو اُسے ماحول کی سنگینی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوا۔ سب وے یہاں سے وہاں تک سنسان تھا اُس کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ خود اُس کے لہو میں لرزش پیدا کر رہی تھی۔ سب وے کے ختم ہوتے ہی بلڈنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بلڈنگ نمبر گیارہ کے گیٹ میں داخل ہو کر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیسرے منزلے پر پہنچا اور وِدّیا چرن کے

فلیٹ کی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

دروازہ وِدّیا چرن ہی نے کھولا تھا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی اُس نے جلدی سے کہا۔ ''ارے انور آؤ۔۔ آجاؤ۔ ہم تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' اندر وِدیا چرن کے پتا کاٹھ کے جھولے پر بیٹھے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے اُسے دیکھتے ہی کتاب بند کر کے بولے۔

''ہم تمھارے لیے فکرمند تھے بیٹا! راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں انکل، مگر ماحول میں عجیب سا تناؤ ہے۔ سڑکیں سنسان ہیں، دُکانیں بند ہیں۔''

''ہاں دو تین دن سے یہی حال ہے۔ مگر آج فضا زیادہ گرم ہے۔''

''میں نے صبح تمھارے گھر پر فون کیا تھا۔'' وِدّیا چرن بولا۔

''بھابھی نے بتایا تم ایک گھنٹہ پہلے نکل چکے ہو۔ اگر تم فون پر ملتے تو میں تمھیں آج آنے سے روک دیتا۔''

''کیا بات ہے؟ معاملہ زیادہ گمبھیر ہے کیا؟''

''کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی ہیں اور طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کل رات دھاراوی میں تقریباً سو جھونپڑے جلا دیے گئے۔ دھواں صبح تک یہاں سے بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی ٹیلیفون پر خبر ملی ہے کہ جوگیشوری میں بھی کئی چالیوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔''

اب اُس کا دل بھی بھاری پتھر کی طرح دھیرے دھیرے تہ آب ہوتا جارہا تھا۔ اندر سے ایک موہوم سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اُسے چپ دیکھ کر وِدّیا چرن نے جلدی سے کہا۔

''پریشانی کی بات نہیں۔ یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ لاؤ بریف کیس مجھے دو۔''

وِدّیا چرن نے بریف کیس اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وِدّیا چرن کی بیوی سُشما پانی کا لوٹا اور گلاس لے آئی۔ اُسے نمسکار کیا اور تپائی پر لوٹا اور گلاس رکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''بھابھی اور بچے کیسے ہیں؟''

''اچھے ہیں۔'' اُس نے بھی رسماً مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اتنے میں وِدّیا چرن کی ماں اور آرتی بھی آگئیں۔ ماں نے کہا۔

''وِدّیا! انور کا منہ ہاتھ دُھلاؤ کھانا تیار ہے۔'' تھوڑی دیر بعد فرش پر چوکیاں بچھا دی گئیں۔ سب لوگ چوکیوں پر بیٹھ گئے۔ ہر ایک کے سامنے ایک ایک تھالی رکھ دی گئی۔ سُشما اور آرتی سب کو کھانا پروسنے لگیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر کہا۔

''شیام دکھائی نہیں دے رہا ہے؟''

''کالج گیا ہے بس آتا ہی ہوگا۔''

کھانا کھانے کے بعد اُس نے طشتری سے سُپاری کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وِدّیا! اب ہمیں چل کر اپنا کام کر لینا چاہیے۔ میں وہیں سے واپسی کے لیے بس پکڑ لوں گا۔''

''مگر آج تو دنگے کی وجہ سے آفس بند ہے۔ میں نے صبح تمھیں اسی لیے تو فون کیا تھا۔''

''اوہو!۔۔'' اُس کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں گہری ہوگئیں۔

''تو پھر مجھے اجازت دو۔ مجھے فوراً نکلنا چاہیے ورنہ سلمٰی اور امّی پریشان ہوجائیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ مگر میرا خیال ہے تم بس کے بجائے ٹرین سے جاؤ تو بہتر ہے۔ چلو میں تمھیں اسٹیشن تک چھوڑ دوں۔''

''انکل اجازت دیجیے۔'' اُس نے وِدّیا چرن کے پتا کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا ہم تمھیں رُکنے کے لیے بھی تو نہیں کہہ سکتے۔ ہوشیاری سے جانا، پونے پہنچتے ہی فون کرنا۔'' ان کے لہجے میں تردد تھا۔

اتنے میں کال بیل بجی۔ وِدّیا چرن نے دروازہ کھولا۔ شیام اندر آیا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی ''ارے انور بھیّا آپ کب آئے؟'' کہتا ہوا اُس کی بغل میں آکر بیٹھ گیا۔

''بس ایک گھنٹہ پہلے آیا ہوں، کہو تمھاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''فرسٹ کلاس۔''

''شیام باہر کیا حال ہے؟'' وِدّیا چرن نے دریافت کیا۔

''بھیّا! حال اچھا نہیں ہے، ابھی اسٹیشن کے باہر کسی کو چھرا مار دیا گیا ہے۔ پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی ہیں۔ اسٹیشن کے اطراف کرفیو لگ گیا ہے۔''

سب ایک دم سے چُپ ہوگئے۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سب اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وِدّیا چرن نے کھنکار کر کہا۔

''ٹھیک ہے میں انسپکٹر راناڈے کو فون کر کے پوچھتا ہوں۔''

وِدّیا چرن نے اٹھ کر نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر تک کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھتا ہوا دوبارہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

''کیا کہا انسپکٹر نے۔؟'' اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ کہتا ہے ٹرینیں تو چل رہی ہیں مگر حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی بھی وقت پورے علاقے میں کرفیو لگ سکتا ہے۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ماہم میں بھی زبردست فساد پھوٹ پڑا ہے۔''

''مگر مجھے تو آج ہی جانا ہوگا وِدّیا، ورنہ وہاں سب پریشان ہوجائیں گے۔''

ایک بار پھر سب چُپ ہوگئے۔ وِدّیا چرن کے باپ نے کہا۔

''بیٹا انور! میری بات مانو تو آج رک جاؤ۔ کل صبح اپنا کام کر کے نکل جانا۔ ہوسکتا ہے کل تک حالات نارمل ہوجائیں۔ بہو کو فون کر کے بتا دو کہ تم یہاں رُکے ہو۔''

''مگر انکل میں سمجھتا ہوں، میں ابھی روانہ ہوجاؤں تو شام تک پونے

پہنچ جاؤں گا۔ اگر کل بھی حالات ۔۔۔۔"

اتنے میں پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ سڑک سے پولیس وین گزر رہی تھی۔ اور اُس پر کرفیو کا اعلان ہو رہا تھا۔

"لو کرفیو لگ گیا۔ میں نہ کہتا تھا بہت جلد کرفیو لگنے والا ہے۔"

شیام نے دبے دبے جوش سے کہا اور اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ وِدّیا کے پتا نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

"شیام کھڑکی بند کر کے چپ چاپ اندر آکر بیٹھو۔ وِدّیا سب کمروں کی کھڑکیاں بند کردو۔"

وِدّیا اٹھ کر کسی سعادت مند بچے کی طرح کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ ماں، سُشما، آرتی اندر والے کمرے کے دروازے میں چپ چاپ کھڑی تھیں۔ وِدّیا کے پتا اُٹھ کر بلا وجہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ شیام کچھ خفا خفا صوفے پر دھپ سے آکر بیٹھ گیا۔ کھڑکیاں بند کردینے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ وِدّیا کا سات برس کا لڑکا پِنّو اپنی دادی سے پوچھ رہا تھا۔

"دادی، دادی کرفیو کیا ہوتا ہے؟"

مگر کسی نے بھی اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب نیم اندھیرے میں خاموش پرچھائیوں کی طرح بے حس وحرکت نظر آرہے تھے۔ صرف وِدّیا کے پتا پشت پر ہاتھ باندھے بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ان کا بدن کمر سے اوپر بے لباس تھا۔ گلے میں جینو پڑا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا اور پشت پر گلہری کی دُم کی مانند چھوٹی سی چٹیا لٹک رہی تھی، ماتھے پر تلک لگا تھا۔ کمر کے نیچے انھوں نے سفید دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اُس نے انھیں بارہا اِسی حلیے میں دیکھا تھا۔ برسوں سے دیکھتا آیا تھا۔ وہ ایک مذہبی شخص تھے مگر ان کے خیالات سیکولر تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کی بھی اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے۔ وہ اُن کی بے حد عزت کرتا تھا۔ وہ بھی اُس سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ اُن سے مل کر اُن سے باتیں کر کے اُسے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ کسی پُرانے پیپل کے سایے میں بیٹھا۔ کسی بوڑھے جٹا دھاری جوگی سے گیان دھیان کی باتیں سُن رہا ہو۔ مگر آج اچانک وہ اُسے بہت اجنبی لگے۔ جیسے اُس کا اُن سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو، ماں، سُشما، آرتی، وِدّیا چرن، شیام سب کے سب اجنبی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ اُسے شدید پیاس کا احساس ہوا مگر اُس وقت پانی مانگنا اپنی کمزوری ظاہر کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر صرف زبان پھیر کر رہ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے کمرے کی فضا کچھ زیادہ ہی بوجھل ہوگئی تھی۔ ان میں سے کوئی روشنی کیوں نہیں کرتا؟ دفعتاً وِدّیا چرن نے اٹھ کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ جیسے اُس نے اُس کے دل کی بات سُن لی ہو، کمرے میں روشنی ہوگئی۔ روشنی ہوتے ہی کمرے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ پتا دوبارہ جھولے پر جاکر بیٹھ گئے۔ جھولا کسی شکارے کی طرح دھیرے دھیرے ڈولنے لگا۔ شیام نے اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ پِنّو دوڑ کر جھولے کی سلاخ پکڑے اُس پر کھڑا ہوگیا۔ سُشما اور آرتی اندر کے کمرے میں چلی گئیں۔ ماں اُس کے قریب سرک آئی اور دھیرے سے بولی۔ "بیٹا انور یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ تم گھبراؤ مت، یہاں کوئی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جاؤ۔ بہو کو فون کردو۔ اُسے تسلی دینا وہ بے چاری گھبرا رہی ہوگی۔ کل جیسے ہی حالات ٹھیک ہوجائیں گے تم چلے جانا۔"

اُس نے ماں کو غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سوائے ممتا کے کچھ نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر چھانے والے انجانے خوف کی گرفت کچھ کمزور پڑ گئی۔ اُسے اندر سے قدرے راحت کا احساس ہوا۔ کچھ دیر پہلے اُسے جو اجنبیت محسوس ہو رہی تھی وہ دھیرے دھیرے زائل ہونے لگی۔ خوف نے بدگمانی کی دیوار کھڑی کردی تھی، خوف کے کم ہوتے ہی بدگمانی کی دیوار بھی بھربھرا کر ڈھے گئی۔ اُس نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اٹھ کر ریسیور کے پاس گیا۔ پونے کے نمبر ڈائل کیے۔ ریسیور سلمیٰ نے ہی اُٹھایا۔ اُس کی آواز سنتے ہی سلمیٰ کی آواز روہانسی ہوگئی۔

"آپ کیسے ہیں؟ آپ کے جانے کے بعد وِدّیا چرن بھائی کا فون آیا تھا۔ آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ آپ جلدی گھر آجایئے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" سلمیٰ نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ اُس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو پُرسکون بناتے ہوئے کہا۔

"سلمیٰ گھبراؤ مت، میں کل تک واپس آجاؤں گا۔ میں اس وقت وِدّیا چرن کے گھر سے بول رہا ہوں۔ معمولی سی جھڑپیں ہیں کل تک حالات نارمل ہوجائیں گے۔"

"مگر آپ کل تک کیوں رُک رہے ہیں۔ کام ہوگیا تو آج شام تک آجایئے نا۔"

"کام ابھی نہیں ہوا ہے، جس پارٹی سے ملنا ہے آج اُن کا دفتر بند ہے کل صبح کاغذات مکمل کر کے میں دوپہر تک پونے آجاؤں گا۔ امی سے بھی کہنا گھبرانے کی بات نہیں۔ یہاں وِدّیا چرن میرے ساتھ ہے۔ ساجد ماجد کو پیار کرنا۔"

"اپنی ماں کو میرا نمسکار کہنا۔" وِدّیا کی ماں نے بلند آواز سے کہا۔

"آنٹی ماں کو نمسکار کہہ رہی ہیں، میں رات میں پھر فون کروں گا۔ اچھا رکھتا ہوں خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے سلمیٰ نے بھی مری آواز میں 'فی امان اللہ' کہا۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اچھا ہوا تم نے بھابھی کو کرفیو کے بارے میں نہیں بتایا۔" وِدّیا بولا۔

"مگر کل کے اخبار کے ذریعے اُسے ساری خبریں مل جائیں گی۔ بہت پریشان ہوگی وہ۔"

اُس نے ایک بار پھر ماتھے سے پسینہ پوچھا۔ اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اِدھر آؤ میرے ساتھ۔" ودّیا چرن اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ اُس میں ایک بیڈ لگا تھا۔ دو سنگل صوفے تھے۔ لکھنے کی ایک میز اور کچھ کتابیں تھیں۔

"یہ میرا لکھنے پڑھنے کا کمرہ ہے۔ ابھی حال ہی میں بنایا ہے۔ تم یہاں آرام کرو۔" ودّیا چرن نے کھڑکی کھول کر پردہ سرکاتے ہوئے کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پتا جی خواہ مخواہ گھبراتے ہیں کھڑکی کھلی رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔"

اُس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی بڑی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ مگر اس وقت سڑک ویران تھی۔

"اس طرف باتھ روم ہے۔ چاہو تو نہالو۔ فریش ہو جاؤ گے۔ اب آرام کرو۔ چار بجے چائے پر ملیں گے۔"

پھر اُس نے آگے بڑھ کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمھاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔ مگر تم بالکل پریشان مت ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھیں پونے حفاظت سے پہنچانے کی ذمّے داری میری ہے۔"

اُس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ودّیا کی جانب دیکھا اور صوفے پر پسر گیا۔ "میں ٹھیک ہوں ودّیا۔ تم فکر مت کرو۔"

"اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دینا۔" ودّیا چرن باہر نکل گیا۔

رات میں ٹی۔وی۔ کی خبروں میں شہر میں ہونے والے ہنگاموں کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئیں۔ ٹی۔وی۔ پر دکھائے جانے والے وحشت خیز مناظر سے پتہ چل رہا تھا کہ فسادات پورے شہر میں پھیل چکے ہیں اور متعدد علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آخر میں پولیس کمشنر کی طرف سے معروف احمقانہ جملہ دوہرایا گیا۔ "مگر حالات قابو میں ہیں۔" اُس کی بے چینی میں اضافہ ہوگا۔ خبریں ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ وہ تیزی سے اُٹھا اور اُس نے پونے اپنے گھر پر فون لگایا۔ مگر بار بار رنگ کرنے کے باوجود فون نہیں لگا۔ شاید لائن میں کچھ گڑبڑی تھی۔ وہ قدرے جھنجھلاتا ہوا واپس آکر بیٹھ گیا۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے اور بیٹھے ہوئے خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ پتا کہہ رہے تھے۔ "کیا ہو گیا ہے لوگوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح قتل کر رہے ہیں۔ میں حیران ہوں، کیا ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر نفرت کر سکتا ہے!"

"پتا نہیں یہ فسادات دیش کو کہاں لے جائیں گے۔" ودّیا چرن نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ماں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ایشور سب کی رکشا کرے۔"

پھر سب اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوشش کے باوجود اُس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ خیالات ذہن میں بگولوں کی طرح گھوم رہے تھے مگر الفاظ زبان پر آنے سے پہلے پانی کی سطح پر اُبھرتے بُلبلوں کی طرح دم توڑ دیتے تھے۔ اُسے لگا وہ خاردار جھاڑیوں میں گھر گیا ہے ایک معمولی سی حرکت سے بھی اُس کے جسم میں کئی نوک دار کانٹے چُبھ جائیں گے۔ اس سے پہلے اُس نے کبھی ایسی بے بسی محسوس نہیں کی تھی۔ اتنے میں شیام اُٹھا اُس نے کیرم بورڈ نکالتے ہوئے کہا۔

"انور بھائی! آیئے دو دو ہاتھ کیرم کے ہو جائیں۔"

اُسے راحت کا احساس ہوا جیسے کسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے ڈوبنے سے بچا لیا ہو۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ کیرم بچھا دیا گیا۔ ایک طرف آرتی اور ودّیا چرن ہو گئے اور دوسری طرف وہ اور شیام بیٹھ گئے۔ کھیل شروع ہو گیا۔

سیاہ اور سفید گوٹوں کو ایک دائرے میں رچا گیا۔ اسٹرایکر سے ضرب لگائی گئی۔ گوٹیں بکھر گئیں۔ اُس کے بعد اسٹریک سے گوٹیں ٹکراتی رہیں۔ کیا سیاہ اور کیا سفید جو جس کی زد میں آتا وہ اسٹرایکر کی معمولی ضرب سے پاکٹ میں پہنچا دیا جاتا۔ وہ کھیلنے کو تو کیرم کھیل رہا تھا مگر اُس کے ذہن میں بار بار فسادات کے مناظر رقص کر رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانات چیختی چلاتی عورتیں، روتے بلکتے بچے، رینگتے لڑکھڑاتے بوڑھے، تلواریں سونتے ہوئے اور نیزے سیدھے کیے ہوئے نوجوان اور ان سب پر اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے لرزہ براندام کر دینے والے نعروں کی گونج۔

"انور بھائی کیا سوچنے لگے؟ کوئن لیجیے۔ دیکھیے آپ کے ہاتھ کے پاس ہے۔" شیام نے اُسے ٹوکا۔

"کہاں؟" اُس نے چونک کر دیکھا، کوئن بالکل اُس کی زد میں تھی۔ اُس نے اسٹرائیکر سے ضرب لگائی۔ کوئن خانے سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ اور کیرم کی سطح پر دیر تک لرزتی رہی۔

سات آٹھ برس پہلے ایک بار بقرعید کے موقع پر اُس نے اپنے ہاتھ سے بکرے کی قربانی دی تھی مگر ابھی اُس کے گلے پر پوری چھری پھری بھی نہیں تھی کہ بکرا تڑپ کر اُس کی گرفت سے نکل گیا اور اٹھ کر ایک طرف بھاگا۔ اُس کے نصف کٹے ہوئے گلے سے خون کا فوّارہ اُبل رہا تھا۔ لوگوں نے دوڑ کر بکرے کو پکڑ لیا مگر وہ دوبارہ اُس کی گردن پر چھری نہیں چلا سکا۔ کسی اور نے ادھوری قربانی کو پُورا کیا۔ اُس کے بعد اُس نے کبھی بکرا ذبح نہیں کیا۔ اُس لرزتی سرخ کوئن کو دیکھ کر جانے کیوں اسے وہ نیم بسمل بکرا یاد آگیا۔

"کیا انور بھائی اتنی آسان گوٹ بھی آپ نہیں لے پائے۔"

شیام نے تاسف ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری شیام، مجھے نیند آرہی ہے۔"

اُس نے کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔

"شیام تم اور آرتی کھیلو۔ انور کو آرام کرنے دو۔ چلو انور، اندر چلتے ہیں۔" ودّیا چرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بار پھر فون ٹرائی کرتے ہیں۔"

"ضرور، ضرور۔" وِدّیا نے پلٹ کر نمبر ڈائل کیے۔ دو تین بار کوشش کرتا رہا۔ پھر مایوسی سے گردن ہلا کر بولا۔

"مشکل ہے۔ شاید لائن ہی ڈیڈ ہوگئی ہے۔"

وہ چپ چاپ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اُس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ سلمیٰ اور بچوں کی خبر مل جاتی تو شاید اُسے قدرے اطمینان ہوجاتا۔ اُسے اپنی بے بسی کا شاید احساس ہوا۔ جی چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر رونا بھی اُس کے لیے آسان نہیں تھا۔ یہ لوگ جو ہر طرح سے اُس کی دلجوئی میں لگے ہیں۔ کیا سوچیں گے؟ وہ رو کر نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو ذلیل کرلے گا بلکہ اُن کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائے گا۔ شاید بے چارگی کی انتہا یہی ہے کہ انسان رونا چاہے اور رونے سے قاصر رہے۔ اتنے میں "چٹ" کی آواز آئی۔ اور کمرے کی بتی گل کردی گئی۔ وہ چونک کر پلٹا۔

"کچھ نہیں۔ میں ہوں۔ سوجاؤ۔" وِدّیا چرن کمرے کی بتی گل کر کے آہستہ سے دروازہ بھیڑ رہا تھا۔

وِدّیا چرن جا چکا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کسی کتّے کے بھونکنے تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ بھی ڈرے سہمے اپنے اپنے ٹھکانوں میں دُبک گئے تھے۔ صرف رہ رہ کر دور سے پولیس کی سیٹی اور کبھی کبھی سائرن کی آواز سنائی دے جاتی۔ پھر شاید اُس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں رات کے کتنے بجے ہوں گے۔ کسی آہٹ سے وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اندھیرا اور سناٹا اُسی طرح اُس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

نہیں۔۔۔ سناٹے کی دیوار میں ہلکے ہلکے شگاف پڑ رہے تھے۔ اُسے بہت دور سے سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی دبی دبی سی چیخیں اور شور سنائی دیا۔ وہ بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے آہستہ سے کھڑکی کھولی۔ باہر جھانکا۔ سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ مگر مغربی جانب سے دور اُفق میں دھواں سا اُٹھتا دکھائی دیا۔ آسمان بھی قدرے سُرخ ہو رہا تھا۔ شاید وہاں زبردست آگ لگی تھی۔ شور کی آواز بھی اُسی جانب سے آرہی تھی۔ اتنے میں اُسے سڑک پر کسی ٹرک کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ ایک ٹرک اُسی جانب سے تیزی سے آرہا تھا۔ اُسے اندھیرے میں صاف دکھائی تو نہیں دیا مگر اتنا اُس نے ضرور دیکھا کہ اُس ٹرک میں کئی لوگ اندر دُبکے بیٹھے ہیں۔ دو ایک کے ہاتھوں میں ہتھیار بھی چمک رہے تھے۔ اُس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اتنے میں اُسے اپنے کمرے کے باہر ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک نامعلوم اندیشہ سانپ کے پھن کی طرح بار بار اُس کے ذہن میں لہرانے لگا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ ایسا تو نہیں پاس پڑوس والوں کو معلوم ہوگیا ہو کہ اُن کا ایک دشمن یہاں پناہ لیے ہوئے ہے۔ اور اب رات گئے وہ اُسے اپنے حوالے کرنے کا تقاضہ کر رہے ہوں، اس نے ٹٹول کر سوئچ آن کردیا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور وِدّیا چرن اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے بتّی کیوں جلا دی؟"

"کچھ نہیں۔ اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔"

وِدّیا چرن کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا پھر صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"میں اس سے پہلے بھی تمھارے کمرے میں جھانک چکا ہوں۔ تم سو رہے تھے۔"

"تم سوئے نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" وِدّیا چرن اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

"کیوں؟"

"مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ شاید تم اپنے آپ کو یہاں محفوظ نہیں سمجھ رہے ہو۔"

"نہ نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ وِدّیا میں جانتا ہوں۔ تم مجھ پر آنچ نہیں آنے دوگے۔ پھر بھی اطراف کے ماحول سے ایک خوف تو محسوس ہوتا ہی ہے۔"

"تمھاری فیلنگ کو میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر اتنا یاد رکھو اطراف میں کیسی ہی آگ لگی ہو۔ میرے صرف ایک فون پر یہاں پولیس کی ایک پوری بٹالین آسکتی ہے۔ پولیس کمشنر میرا دوست ہے۔ تم چاہو تو میں ابھی تمھاری اُس سے بات کراسکتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وِدّیا تم مجھے غلط مت سمجھو۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔"

وِدّیا چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اچانک پوچھا۔ "کافی پیو گے؟"

"پی لیں گے۔" اُس نے گردن ہلا دی۔

"رکو، میں ابھی بنا کر لاتا ہوں۔"

صبح ناشتے پر ایک بار پھر سب گھر والے اکٹھا ہوئے۔ باہر حالات جوں کے توں برقرار تھے۔ صرف دو گھنٹے کے لیے کرفیو ریلیز کیا گیا۔ آٹھ سے دس تک۔ دس بجے دوبارہ کرفیو نافذ کردیا گیا۔

وِدّیا نے ریلوے اسٹیشن، پولیس اسٹیشن، ایس ٹی بس ڈپو، ایشیاڈ بس اڈہ، ٹیکسی اڈہ ہر جگہ فون کر کے حالات دریافت کیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ "حالات خراب ہیں۔ بہتر ہے، سفر نہ کیا جائے۔"

پونے کی لائن حسب سابق ڈیڈ تھی۔ ٹیلیفون ایکس چینج سے انکوائری کی گئی۔ مگر کوئی معقول جواب نہیں ملا۔ اُس کی پریشانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مگر اپنی پریشانی کو چھپائے دیر تک وِدّیا، وِدّیا کے پتا، ماتا، شیام اور آرتی سے باتیں کرتا رہا۔ بچّو سے دو پوئم سنیں۔ اُسے تین سینگوں والے راکشش کی کہانی بھی سنائی۔ جس میں راجکمار اپنی تلوار سے یکے بعد دیگرے راکشش کی تینوں سینگیں کاٹ دیتا ہے۔ بچّو خوش ہوکر دیر تک ہنستا اور تالیاں

بجاتا رہا۔ وہ سوچنے لگا چھ فٹ کا راجکمار چھتیس فٹ کے راکشس کو کیوں کر مار سکتا ہے۔ مگر بچے کہانی کی باتوں پر کتنی جلدی یقین کر لیتے ہیں۔ انسان جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے۔ تشکیک، بدگمانی اور بے اعتمادی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ پپّو کو یوں تالیاں بجاتے دیکھ کر اُسے بے اختیار اپنے بچے ساجد ماجد یاد آ گئے۔ اُس نے جھک کر پپّو کے ماتھے پر بوسا دیا۔ اُسے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی وہ اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔

کھڑکی میں کھڑے کھڑے وہ دیر تک سنسان سڑک کو گھورتا رہا۔ جس طرف سے رات میں دھواں اٹھتا دکھائی دیا تھا۔ اب وہاں مطلع صاف تھا۔ سامنے بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کچھ لڑکے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پولیس وین دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی دور نکل گئی۔ اتنے میں بائیں جانب سے کچھ شور سنائی دیا۔ اُس نے کھڑکی میں سے گردن نکال کر دیکھا۔ بائیں جانب کی ایک تنگ گلی سے ایک دُبلا پتلا نوجوان تیزی سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی اور اُس کی کلائیاں رسّی سے بندھی تھیں۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''بچاؤ، بچاؤ، پانی، پانی۔'' شاید اُس کے کپڑوں میں مٹی کا تیل چھڑکا گیا تھا۔ کیونکہ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ اُس کی چیخیں سن کر آس پاس کی بلڈنگوں کی کھڑکیاں ایک ایک دو دو کر کے کھلنے لگیں۔ کچھ لوگ گردنیں نکالے اُسے دیکھنے لگے۔ وہ دُبلا نوجوان منہ اُٹھا اُٹھا کر چیخ رہا تھا۔

''میرے ہاتھ کھول دو۔ مجھے مار کر تمھیں کیا ملے گا۔ پانی، پانی۔''

وہ اُس بلڈنگ کے کمپاؤنڈ کی طرف بھاگا۔ جہاں چند نوجوان کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا انھوں نے گیٹ بند کر دیا۔ وہ اُن سے گڑگڑا کر ''پانی پانی'' کرتا رہا۔ مگر وہ لوگ مُڑ کر بلڈنگ کے اندر چلے گئے۔ اب آگ کے شعلوں نے نوجوان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک ایک رقص کرتا ہوا شعلہ نظر آ رہا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے گرا اور بیچ سڑک پر لوٹنیں لگانے لگا۔ اُس کی کربناک چیخیں برابر جاری تھیں۔ آخر رسّی سے بندھے اُس کے ہاتھ کھل گئے۔ وہ یکبارگی تڑپ کر اُٹھا اور ہاتھوں سے دیوانہ وار اپنے سلگتے ہوئے کپڑے نوچنے لگا۔ مگر پھر لڑکھڑا کر گرا اور دوبارہ زمین پر تڑپنے لگا۔ اب اُس کی چیخیں کراہوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کی چھٹپٹاہٹ بھی دھیرے دھیرے کم ہونے لگی تھی۔ کپڑے خاکستر ہو کر بدن سے چپک گئے تھے۔ پورا بدن جھلس کر سیاہ کوئلہ ہو گیا تھا۔ آخر اُس کی کراہیں بھی تھم گئیں۔ بس بجھتی آگ کے ساتھ رہ رہ کر اُس کے بدن کا کوئی حصہ پھڑک جاتا تھا۔

کھڑکی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے وہ اُس منظر کو کسی ڈراؤنے خواب کی طرح دیکھتا رہا۔ کنپٹیوں میں ایسی دھمک ہو رہی تھی جیسے اُسے کسی نقارے میں قید کر کے اوپر سے ضربیں لگائی جا رہی ہوں۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے۔

نیچے سڑک پر نوجوان اب پوری طرح کوئلہ ہو چکا تھا۔ آگ بھی بجھ گئی تھی۔ بس ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اتنے میں پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ کھڑکیوں سے جھانکتے لوگوں نے اپنی اپنی کھڑکیوں کو بند کر لیا۔ مگر کچھ لوگ اب بھی بند کھڑکیوں کی خفیف جھریوں سے جھانک رہے تھے۔

وہ بھی پیچھے ہٹ کر لرزتے ہاتھوں سے کھڑکی کو بند کر کے پتلی سی جھری میں سے باہر دیکھنے لگا۔ پولیس کی وین جھلسی لاش سے ذرا فاصلے پر آ کر رُک گئی۔ چار پانچ کانسٹیبل وین سے نیچے اُترے۔ سامنے والی سیٹ سے ایک انسپکٹر اُترا۔ انسپکٹر اطمینان سے چلتا ہوا لاش کے قریب آیا۔ اُس نے رومال سے اپنی ناک اور منہ کو ڈھک رکھا تھا۔ پولیس کے سپاہی بھی اپنی اپنی ناکوں کو چٹکیوں میں دبائے اُس کے پیچھے پیچھے آ کر لاش کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ لاش بالکل برہنہ تھی اور جھلس کر بڑی بدہیئت ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نے کچھ کہا۔ ایک سپاہی اپنی ناک پکڑے پکڑے جھکا اور اپنی لمبی چھڑی سے لاش کو ٹھوکے دینے لگا۔ پھر نفی میں گردن ہلاتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر نے گردن اٹھا کر اطراف کی بلڈنگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ نیم وا کھڑکیوں سے جھانکتے سر کچھوؤں کی گردنوں کی طرح اندر سمٹ گئے۔ انسپکٹر نے چلا کر کہا۔

''کس نے جلایا اس کو؟۔ بتاؤ کون ہے وہ؟ جواب دو۔'' کھڑکیوں کی جھریاں اور پتلی ہو گئیں۔ انسپکٹر اپنا ڈنڈا ہلاتا ہوا بائیں طرف کی گلی کے نکڑ تک گیا۔ گلی میں جھانک کر کچھ دیکھا اور پھر واپس آ کر لاش کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر بلڈنگوں کی کھڑکیوں کی طرف گردن اٹھائی اور زور سے چیخا۔

''ارے کم سے کم اس لاش کو ڈھانکنے کے لیے کوئی کپڑا تو پھینکو۔ تم لوگوں میں کچھ انسانیت ہے یا نہیں۔''

تھوڑی دیر تک چاروں طرف ایک تکلیف دہ سناٹا چھایا رہا۔ پھر سامنے کی بلڈنگ کے فرسٹ فلور کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک بوڑھے شخص نے اپنا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال کر سڑک کی طرف ایک سفید چادر اچھال دی۔ پھر ایک اور کھڑکی کھلی۔ ایک عورت نے سر باہر نکالا اور اُس نے بھی ایک تہہ کی ہوئی سفید چادر سڑک کی طرف پھینکی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکیاں کھلتی گئیں اور تین منٹ کے اندر سات سفید دودھ چادریں سڑک پر اچھال دی گئیں۔ انسپکٹر چلایا۔

''بس، بس، اب بس کرو بہت ہو گیا۔''

دو کانسٹبل آگے بڑھے انھوں نے ایک چادر اٹھائی، اُس کی گھڑی کھولی اور اُس کے چاروں کونے کو پکڑ کو لاش کو ڈھک دیا۔

وہ کھڑکی بند کر کے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے ذہن میں اُٹھتے خوف کے بگولوں کا زور اب دھیرے دھیرے کم ہونے لگا ہے۔ اُن بگولوں کی جگہ ایک پُر ہول خالی پن نے لے لی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر یک لخت ہر خوف اور اندیشے سے اوپر اُٹھ گیا تھا۔ □□□

فیروز عالم

سلام بن رزّاق سے گفتگو

سلام بن رزّاق دورِ حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی پیدائش 15/نومبر 1941 کو ممبئی کے قریب پنویل میں ہوئی۔ آپ نے میٹرک تک کی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ بعد ازاں ممبئی آگئے اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ آپ 1999 میں اسکول کی ملازمت سے بطور پرنسپل سبک دوش ہوئے۔ اب تک آپ کی سات کتابیں منظرِعام پر آچکی ہیں۔ "ننگی دوپہر کا سپاہی" (افسانوی مجموعہ 1977)، "ماہم کی کھاڑی" (مراٹھی کہانیوں کا اردو ترجمہ 1980)، "معبّر" (افسانوی مجموعہ 1987)، "کام دھینو" (ہندی 1988)، "شرپید کرشن کولہاٹکر" (مونو گراف 1990)، "عصری ہندی کہانیاں" (1995) اور "شکستہ بتوں کے درمیاں" (افسانوی مجموعہ 2001)۔ سلام بن رزّاق کی کہانیوں کا مراٹھی، ہندی، تیلگو اور پنجابی کے علاوہ انگریزی، روسی اور ناروین میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ آپ نے مختلف ڈراموں، فلموں اور ٹی وی سیریلوں کا اسکرپٹ بھی لکھا ہے۔ آپ کو ساہتیہ اکادمی انعام برائے ترجمہ، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی انعام (چار بار) اترپردیش اردو اکادمی انعام (دوبار)، بہار اردو اکادمی انعام (دوبار) اور کتھا انعام مل چکا ہے۔ حال ہی میں افسانوی مجموعہ "شکستہ بتوں کے درمیاں" پر ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا ہے۔

سوال: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: میں ممبئی سے چند کوس کے فاصلے پر واقع پنویل میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا۔ ساتویں تک میں نے اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کی لیکن ہمارے علاقے میں کسی ہائی اسکول میں اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے باعث مجھے آٹھویں سے میٹرک تک مراٹھی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ ذریعۂ تعلیم تبدیل ہونے سے پریشانی ہوئی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو کے ساتھ ساتھ مراٹھی سے بھی شغف پیدا ہوگیا۔

سوال: آپ افسانہ نگاری کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

جواب: اگرچہ لکھنا ایک شعوری عمل ہے مگر لکھنے کی خواہش ادیب کے لاشعور کی گہرائیوں میں پروان چڑھتی رہتی ہے اور مناسب وقت پر الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتی ہے۔ کئی بار ہمیں خود پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے کب اور کیسے لکھنا شروع کیا۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میں ابھی چھوٹا تھا تیرنا نہیں جانتا تھا مگر تالاب کے کنارے بیٹھ کر دوسرے بچوں کو تیرتے ہوئے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ایک دن اچانک کسی نے پیچھے سے دھکا دے دیا۔ میں پانی میں گر کر غوطے کھانے لگا مگر ڈوبنے سے بچنے کے لیے غیر ارادی طور پر ہاتھ پاؤں بھی چلاتا رہا۔ بالآخر کسی طرح کنارے آیا، مگر اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آگئی ہے۔ میرے دل سے گہرے پانی کا خوف جاتا رہا اور میں بھی رفتہ رفتہ دوسرے بچوں کے ساتھ تیرنے لگا۔ میری افسانہ نگاری کا آغاز بھی اسی طرح ہوا۔ بچپن میں میری ماں "نورنامہ" اور اسی طرح کی دیگر کتابیں پڑھتی تھیں۔ اس طرح مجھے بھی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا۔ داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، طوطا مینا، حاتم طائی، باغ و بہار وغیرہ داستانیں صادق سردھنوی، عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول، ابن صفی کے جاسوسی ناول اور جانے کیا کیا پڑھتا رہا۔۔۔۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ پڑھتے پڑھتے کب لکھنا شروع کردیا۔ میری پہلی تحریر وی.ایس. کھانڈیکر کی مراٹھی کہانی "آئی" (ماں) کا ترجمہ تھی جو روزنامہ "انقلاب" میں چھپی۔ "رین کوٹ" میری پہلی کہانی تھی جو ماہنامہ "شاعر" ممبئی میں شائع ہوئی۔ بعد میں پانچ چھ سال تک میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی، 1969 سے پھر لکھنا شروع کیا۔

سوال : آپ نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس وقت ادبی فضا کیسی تھی؟

جواب : اس زمانے میں پنویل، جہاں میرا بچپن گزرا وہاں تو کوئی خاص ادبی فضا نہ تھی لیکن ممبئی میں صابو صدیق کے مشاعرے میں لوگ ٹرکوں میں بھر کر جاتے تھے۔ ساحر اور مجروح میرے پسندیدہ شاعر تھے اور کرشن چندر اور منٹو پسندیدہ افسانہ نگار۔ کرشن چندر کا رومانوی انداز بے حد اپیل کرتا تھا۔ Mature ہونے کے بعد منٹو میرے آئیڈیل افسانہ نگار بن گئے۔

سوال: منٹو کی کس خصوصیت نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

جواب: منٹو کی نگاہ بے حد تیز تھی، اس کی نظر سماج کے ان گوشوں پر جاتی تھی جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی تھی۔ وہ انسانی نفسیات کے باطن میں اتر کر اس کی پرتیں کھولتا ہے۔ وہ سماج کے ان افراد پر قلم اٹھاتا ہے جنھیں عام طور سے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ طوائفیں، دلال اور جرائم پیشہ افراد اس کے افسانوں کے کردار بنتے ہیں اور اپنے باطن میں چھپی انسانیت سے معاشرے کے نام نہاد شرفا کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھگو بھنگی، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سلطانہ، ممد بھائی اور منگو کوچوان جیسے لازوال کرداروں کی تخلیق صرف منٹو ہی کر سکتا تھا۔

سوال : افسانے اور ناول کی کردار نگاری میں کیا فرق ہے؟

جواب : افسانوں کی کردار سازی میں Sharpness کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں چند سطروں میں کردار کی پوری شبیہہ ابھارنی ہوتی ہے جبکہ ناول میں تمام تفصیلات کی گنجائش ہوتی ہے۔

سوال : آپ اپنے افسانوں کے موضوعات کہاں سے لیتے ہیں؟

جواب : میرا تعلق سماج کے نچلے متوسط طبقے سے ہے اور میں اپنے افسانوں کے موضوعات و کردار بھی اسی طبقے سے لیتا ہوں۔ ممبئی آنے کے بعد میں چالی والے محلے میں رہا اور مضافات کے کرداروں سے روبرو ہوا۔ ''انجام کار''، ''ہدف''، ''بناری ساڑی'' وغیرہ کہانیاں اسی ماحول میں لکھی گئیں۔ یہ سماج کے دبے کچلے اور پسماندہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روز ٹوٹتے ہیں، بکھرتے ہیں مگر دوسری صبح اپنے بستر سے صحیح و سالم اٹھتے ہیں، زندگی سے جدوجہد کرنے کے لیے۔ یہ روز شکست کھاتے ہیں مگر زندگی جینے کا حوصلہ نہیں ہارتے۔ یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جنھیں حالات نے اپنے چکرویوہ میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس سے نجات پانا چاہتے ہیں مگر ابھیمنیو کی طرح اس کو توڑ کر اس سے باہر نکلنے کا منتر نہیں جانتے۔ میں حالات کے چکرویوہ میں پھنسے انھی بیمار، تھکے ہارے، کمزور اور مظلوم لوگوں کا افسانہ نگار ہوں۔ ان کا دکھ درد، ان کی یاس و محرومی اور ان کا اضطراب و انتشار ہی میرے افسانوں کا محرک و موضوع ہے۔ میرے لیے معاشرے میں رونما ہونے والا ہر واقعہ ایک کہانی ہے اور ہر فرد ایک کردار۔

سوال : آپ کے کرداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مفاہمت پسند ہیں۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ آپ خود ناامیدی کا شکار ہوگئے ہیں۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ سماج میں اب کوئی تبدیلی نہیں آنے والی اور طاقتور کے ذریعے کمزور کا استحصال ہوتا رہے گا؟

جواب: بعض افسانوں کے ساتھ ایک متھ (Myth) جڑ جاتا ہے۔ میرے افسانوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور کہا گیا کہ میرے کردار مفاہمت پسند ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ کردار زندہ ہیں اور زندہ رہنے کے لیے مفاہمت ضروری ہے۔ میرے معاشرے میں کوئی باغی نہیں ہے اس لیے میں باغیوں کی کہانیاں نہیں لکھتا۔ آج ساری قدریں مٹ رہی ہیں۔ مذہب، ذات، قوم اور علاقے کے نام پر لوگوں کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ پورے سماج کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ میرے کردار اسی پارہ پارہ معاشرے کے افراد ہیں اور اس گھناؤنے معاشرے میں جینے اور مرنے پر مجبور ہیں۔ انھیں غصہ آتا ہے، وہ احتجاج بھی کرتے ہیں مگر ان کا غصہ اور احتجاج اس الاؤ کی مانند ہے جس کی آگ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ میرے کردار جس الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں گرچہ اس کی آگ سرد پڑ چکی ہے مگر ان کے لہو میں ایک مدھم چراغ روشن ہے جو ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ میں اپنے افسانوں کے ذریعے اسی بجھے ہوئے الاؤ سے چنگاریاں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے اپنے افسانوں میں ماحول اور معاشرے کی گندگی اور جبر و ناانصافی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر لوگوں کو اس ماحول سے نفرت اور اس صورت حال پر غصہ آئے تو کیا میں کامیاب نہیں ہوں؟ لوگ تصور میں انقلاب دیکھتے ہیں، میں خواب کے بجائے حقیقت کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ ''انجام کار'' میں جب کہانی کا ہیرو شنکر دادا کے ہوٹل میں جا کر بیٹھتا ہے اور بیرے کو آرڈر دیتا ہے تو شنکر دادا کا ردعمل دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ علاقے کا ایک بڑا غنڈہ ہے لیکن اس کے چہرے پر خوف کی لکیر صاف پڑھی جا سکتی ہے۔

سوال :آپ اپنا کوئی افسانہ مکمل کرنے کے بعد کیسا

محسوس کرتے ہیں؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ سیپی کے سینے میں جب کوئی کنکر گڑ جاتا ہے تو وہ اس کے اندر ٹیس پیدا کرنے لگتا ہے۔ سیپی اس ٹیس کو کم کرنے کے لیے اپنے اندر ایک لعاب پیدا کرتی ہے اور لعاب کو اس چبھنے ہوئے ذرّے کے گرد لپیٹتی رہتی ہے۔ کنکر پر لعاب کی تہہ جمتی رہتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ لعاب سے مل کر موتی بن جاتا ہے۔ افسانہ لکھنا بھی دراصل اپنے اندر چبھنے کسی خیال کی ٹیس سے نجات پانے کا عمل ہے۔

سوال: اردو میں افسانوی ادب کی تنقید شاعری کے مقابلے کم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ہمارے یہاں شاعری کی قدیم اور وقیع روایت رہی ہے اس لیے ناقدین نے شروع سے ہی اس پر توجہ دی۔ شاعری کے مقابلے افسانے کی عمر بہت کم ہے۔ 1960 کے بعد نقادوں نے اس جانب خاصی توجہ دی لیکن افسانے کی تنقید کے لیے بھی شعری تنقید کی اصطلاحات سے ہی کام لیا جارہا ہے۔ افسانے اور شاعری کی تنقید الگ الگ ہونی چاہیے۔

سوال: موجودہ دور میں ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کی وجہ سے مطالعے میں کمی آئی ہے۔ کیا مستقبل میں ادب کا وجود خطرے میں آسکتا ہے؟

جواب: پاپولر کلچر، میڈیا اور عالم کاری نے ساری دنیا میں ادب کو حاشیے پر ڈال دیا ہے۔ لفظ کی حرمت کم بھلے ہوجائے، ختم نہیں ہوگی کیوں کہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں چاہیے کہ میڈیا اور کمپیوٹر سے فائدہ ضرور اٹھائیں لیکن انھیں خود پر حاوی نہ ہونے دیں۔ اس کے نقصانات پر بھی نگاہ رکھیں اور اپنی پرانی اقدار، روایات اور ادب سے قطع تعلق نہ کریں۔

سوال: بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شاعروں اور ادیبوں کی ایک نئی نسل منظرِعام پر آئی جسے مابعد جدید کا نام دیا گیا۔ مابعد جدید ادب اور جدید ادب میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: کسی عہد کا نام راتوں رات نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ یادداشت کا حصہ بنتا ہے۔ 1970 کے بعد جو ادب وجود میں آیا اسے مابعد جدید ادب یا معاصر ادب کا نام دیا جارہا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے مثبت عناصر سے کسب فیض کیا۔ ترقی پسند افسانے میں جہاں یک رخا پن اور اشتراکیت کا پروپیگنڈہ حاوی ہوگیا تھا وہیں ترقی پسند مشاہیر کا عامرانہ رویہ بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔ جدیدیت کے نام پر ابہام، تجریدیت اور مغرب کی نقالی پر زور دیا جانے لگا، جس کی وجہ سے افسانہ معمہ بن گیا۔ ہماری نسل کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ اپنا راستہ الگ کیسے بنائے چنانچہ مابعد جدید ادب میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی مثبت اقدار کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایات پر بھی نظر رکھی گئی۔ معاصر افسانے میں علامتیں، اساطیر، تہہ داری اور رمز وکنایہ ہیں لیکن ابہام یا یک رخاپن نہیں ہے۔

سوال: موجودہ عہد میں لکھے جانے والے اردو کے افسانوی ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اردو میں بہت اچھے افسانے نہیں لکھے جارہے ہیں۔ ملک میں اردو کی صورتِ حال، اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہ ہونا اور گھروں میں اردو کے کم ہوتے چلن کی وجہ سے اردو ادیبوں میں بھی مایوسی کا عنصر نظر آتا ہے۔ اردو کے مقابلے ہندی میں زیادہ اچھے افسانے لکھے جارہے ہیں۔

سوال: کیا آپ ملک میں اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں؟

جواب: میں مایوس نہیں ہوں اور مایوس ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب تک زبان کے بولنے اور پڑھنے والے کسی نہ کسی علاقے میں موجود ہیں، زبان زندہ رہے گی۔ ہم اردو والوں نے غلطی یہ کی کہ اس زبان کی ترویج وترقی کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ ہم صرف حکومت سے مدد چاہتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی زبان صرف سرکاری امداد پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہبرو زبان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہودیوں نے صدیوں تک خانہ بدوشی کی زندگی گزاری لیکن زبان کو سینے سے لگائے رکھا۔ ہمیں بھی اردو کے ساتھ اسی محبت کا ثبوت دینا ہوگا۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: کونسل نے اس سلسلے میں بہت اچھے کام کیے ہیں۔ کمپیوٹر کورس کے ذریعے اردو پڑھنے والوں کو روزگار مرکوز تربیت، کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کی اشاعت پر خصوصی توجہ اور اردو سکھانے کے لیے ڈپلوما کورس کی شروعات وغیرہ بہت اچھے اقدام ہیں اور ان سے خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا ہے مگر کونسل کے کاموں کی رفتار میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔

□□□

منظور عثمانی

رپورتاژ

دہلی اردو کتاب میلہ

ادارے نام سے نہیں کام سے چلتے ہیں۔ یوں تو بہت سے ادارے اردو کے فروغ و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن بجا طور پر اردو کی جتنی خدمت اور اس کے فروغ کے جتنے جتن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ صرف اپنے اشاعتی پروگرام کے تحت ہی اس ادارے نے اب تک ایک ہزار کتابیں شائع کی ہیں۔ ایسی ایسی ضخیم کتب جنہیں چھاپنے کا تصور کوئی نجی ادارہ خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مختلف فنون پر شائع کی جانے والی کتب کا دائرہ دیکھیے تو عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً ادبیات، انسائیکلوپیڈیا، لغات، تاریخ، جغرافیہ، تعلیم و تدریس، حیات و خدمات، زبان و لسانیات، سائنس و ٹیکنالوجی، معاشیات، تجارت، سماجیات، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، نفسیات، فنون لطیفہ، قانون، خانہ داری و کتابیات، بچوں کا ادب، درسی کتب اور معاون درسی کتب وغیرہ۔ چنانچہ اگر "مرد فعال" ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل) اپنے کو سب سے بڑے ناشر ہونے کا دعوا کریں تو اس میں مبالغہ آمیزی کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے۔

لیکن جہاں ایک طرف کتابوں کے انبار ہیں تو دوسری طرف اہل نظر کا یہ گلہ (بر بنائے حقیقت) اور فکر بھی ہے کہ اردو قارئین کی روز بروز کم ہوتی تعداد کو بڑھانے کا کیا انتظام کیا جائے۔ اردو کے فروغ کی ضامن ایک انجمن کے سکریٹری صاحب نے جب اپنے اشاعتی کارناموں کا فخریہ ذکر کیا تو سید حامد صاحب نے ان سے دریافت کیا تھا "یہ تو بتائیے کہ قارئین کتنے پیدا کیے ہیں۔" در اصل یہی وہ نکتہ ہے جو حقیقت شناس محبان اردو کو پریشان کیے ہوئے ہے۔

آج صارفیت کا دور ہے۔ "تشہیر" کے ذریعے ضرورت پیدا کی جاتی ہے۔ اردو کے ناشران کتب (واقعتاً اکثر تقسیم کار) کا اپنی مطبوعات کی تشہیر کا طریقہ قطعی ناقص ہے۔ وہ صرف فہرست کتب چھاپ کر کتب خانوں کو بھیجنے پر ہی اکتفا کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دوسرے اردو کتاب میلے کے آخری دن میلے میں شامل چند کتب فروشوں نے یہ احتجاج کر کے تلخی پیدا کر دی تھی کہ تشہیر کی کمی کے باعث کتابوں کی فروخت پر اثر پڑا جب کہ اردو کونسل نے اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ اپنایا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ مصرع ذہن کے پردوں سے بار بار ٹکرایا کہ:

وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر نے زمینی حقیقتوں کا ادراک رکھتے ہوئے "بک پروموشن" کے لیے اردو کتابی میلوں کا تجربہ کیا۔ چنانچہ پچھلے پانچ برسوں میں ہندستان کے مختلف صوبوں میں اردو کتاب میلے برپا کر کے وہ پیروی غالب میں یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش فرما رہے ہیں کہ

"ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق"

6/ مارچ 2005 کو ختم ہونے والا میلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے (انصاری آڈیٹوریم گراؤنڈ میں منعقدہ میلہ) اس سلسلے کی ساتویں کڑی تھی۔ پہلے دو میلے 2000 اور 2001 لال قلعہ دہلی، تیسرا 2002 میں ممبئی میں، چوتھا سری نگر اور پانچواں ممبئی میں اور چھٹا حیدر آباد میں منعقد کیے گئے یعنی

"تری آواز مکے اور مدینے"

ہر سال ان میلوں کا کامیاب انعقاد اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ 2000 میں کیا گیا یہ تجربہ روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے اور یہ اردو کتب کی نمائش و فروخت کا ایک اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ ان کی کامیابیوں سے مسرور ہو کر قومی کونسل سارک ممالک میں بھی ایسے کتاب میلے منعقد کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

کونسل نے موبائل بک وین (Mobile Book Van) بھی شروع کی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو کتابوں کو اردو قارئین کے دروازوں تک پہنچایا جائے تاکہ وہ شکایت نہ کر سکیں کہ دور دراز علاقوں تک اردو کتابیں نہیں پہنچ پاتیں اور قومی کونسل والے یقین کے ساتھ کہہ سکیں

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا

یا

پکارنے کی حدوں تک تو ہم پکار آئے

کتابی میلوں کو کثیر المقاصد بنا دینے پر آرگنائزر کو داد دینی پڑتی ہے۔ ایسا تب ہی ہو پاتا ہے جب مقصد کا تعین واضح ہو۔ قومی اردو کونسل کے سربراہ کے ان الفاظ کو ذہن میں رکھیے کہ "قومی اردو کونسل نے کتابوں کی نمائش اور فروخت کے ساتھ ساتھ اردو سے وابستہ ہر گل کو کھلانے کی کوشش کی ہے تاکہ

اردو کا چمن ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ قارئین کی جانکاری کے لیے عرض کردوں کہ دہلی میں منعقد ہوئے تینوں میلوں کا راقم الحروف عینی شاہد رہا ہے۔ ان میلوں میں مختلف پروگراموں کے ذریعے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، ادیبوں، ثقافتی پروگراموں، شعروشاعری، ڈراما، صحافت، میڈیا، موسیقی وغیرہ غرض ہر شعبے پر دھیان دیا گیا۔ جس نے ان میلوں کی مزید شان بڑھائی۔ ان پروگراموں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر دن انصاری آڈیٹوریم کا اوپن ایئر تھیٹر سامعین/ناظرین سے کھچا کھچ بھرا رہا جسے دیکھ کر وزیرِ تعلیم اور کونسل کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ کو اردو کے تئیں جوش وخروش اور اس کی مقبولیت کا قائل ہونا پڑا۔

دہلی میں ہوئے تینوں اردو کتاب میلوں میں مناسب ترین جگہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (جس کے تعاون سے اس کا انعقاد کیا گیا تھا) تھی۔ جامعہ نے نہ صرف وسیع وعریض اور مناسب جگہ مہیا کی بلکہ بھرپور عملی تعاون بھی دیا جس کا بہترین ثبوت یہ تھا کہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن روزانہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے شانہ بہ شانہ نظر آئے۔ بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود اتنا وقت وہی دے سکتا ہے جو واقعتاً "محبِ اردو" ہو۔ پروفیسر محب الحسن مرحوم کے لائق صاحبزادے کو محبِ اردو کے روپ میں دیکھ کر اس یقین کو تقویت ملی کہ اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ مشیر صاحب کی یہ یقین دہانی بھی امید افزا ہے کہ جامعہ اس فیچر (کتابی میلے) کو مستقل بنانے پر غور کررہی ہے۔

اسی علاقے کا باشندہ ہونے کے ناطے عرض کردوں کہ دہلی ہی نہیں شاید پورے ہندستان میں کوئی دوسرا علاقہ ایسا نہیں جہاں کسی ایک جگہ اتنا تعلیم یافتہ طبقہ رہائش پذیر ہو۔ جامعہ ملیہ کا قرب، تعلیمی سہولیات، مسلمان ملازمین، دہلی سے باہر کے تعلیم یافتہ اردو داں لوگ سب اس جگہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی سبب سے یہاں آبادی کا بے اندازہ پھیلاؤ ہوا ہے۔ اب پرانی دہلی کا بھی رخ ادھر کو ہو چلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دن بھی میلے کی چہل پہل میں کمی نہیں آئی۔

میلے میں سلیقے سے لگائے اسٹال (مناسب کرایوں پر) اور ان کی یکسانیت و یک رنگی بھی میلے کی دلکشی کا باعث تھی۔ نمائش گاہ کے عین مرکز میں اردو کونسل کا چوکور دیدہ زیب اسٹال اور بیچ میں فرشی نشست پنڈال کے حسن کو چار چاند لگارہے تھے اور اس سب پر مستزاد اردو کونسل کا حسنِ انتظام جس کے لیے ڈائرکٹر صاحب اور ان کی پوری ٹیم مبارکباد اور تحسین کی مستحق ہے۔

میلے میں تقریباً 50 اسٹال تھے، جن میں تین کو چھوڑ کر سب دہلی ہی کے کتب فروش تھے۔ کونسل کے اسٹال کے علاوہ اردو اکادمی دہلی، مکتبہ جامعہ، نیشنل بک ٹرسٹ، پبلیکیشن ڈویژن، ایجوکیشنل بک ہاؤس اور فرید بک ڈپو جیسے بڑے اور اہم اشاعتی ادارے اپنی تمام تر مطبوعات کے ساتھ میلے کے وقار میں اضافہ کررہے تھے۔ دو اسٹال سائنسی جریدوں کے بھی تھے ایک سی ایس آئی آر سے نکلنے والے رسالے سائنس کی دنیا (اردو)، وگیان پرگتی (ہندی) اور سائنس رپورٹر (انگریزی) کا اور دوسرا "سائنس" کا۔ اس بار کونسل نے ایک اور جدت یہ کی تھی کہ بچوں کی کتابوں کا الگ اسٹال لگایا تھا جہاں تین سو سے زیادہ کتابیں دستیاب تھیں۔ بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں مکتبہ جامعہ ملک بکڈپو سے بھی خریدی جاسکتی تھیں۔ ملک بکڈپو پر عادل اسیر دہلوی کی تصنیف کردہ 28 کتابیں دستیاب تھیں۔ عادل اسیر شاید اس وقت اکیلے ایسے مصنف ہیں جو اتنی لگن سے بچوں کا ادب تخلیق کررہے ہیں۔

کتاب میلے کے آخری دن یعنی 6 مارچ کو بڑی گہما گہمی تھی۔ آج کے مہمانانِ ذی وقار میں مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل عزت مآب جناب ارجن سنگھ اور پروفیسر سیف الدین سوز تھے جنھیں اردو کونسل کے ذریعے چلائے جارہے انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹرز مراکز میں کامیاب طلبہ کو انعامات بھی تقسیم کرنے تھے۔ اس پروگرام پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے بتایا کہ ایسے تربیتی مراکز کی کل تعداد 22 صوبوں کے 97 اضلاع میں 250 ہے جسے اب تک 18000 طلبہ تربیت حاصل کرکے روزگار پاچکے ہیں۔ جن میں 40% لڑکیاں ہیں۔ لکھنؤ، حیدرآباد، رانچی، سری نگر، امروہہ اور بنگلور کے مراکز صرف لڑکیوں کے لیے مختص ہیں۔ اس کو اردو کونسل کتنی اہمیت دیتی ہے اور کتنی خطیر رقم صرف کررہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف رواں سال میں 75 نئے سینٹرز کھولے گئے ہیں۔ اس اسکیم نے نہ صرف اردو والوں کو روزگار کے مواقع فراہم کیے ہیں بلکہ اردو زبان کو موجودہ دور کی ضرورتوں سے بھی ہم آہنگ کیا ہے۔

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے فروغ نے فنِ خطاطی کو خاصا متاثر کیا ہے چنانچہ اسے جدیدیت سے ہمکنار کرنے کے لیے کونسل نے خطاطی اور گرافک ڈیزائننگ میں دو سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ اس نے کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کے فن کو گرافک ڈیزائننگ اور کمرشیل آرٹ سے جوڑ دیا ہے جس سے کاتبوں کو روزگار ملنے کے ساتھ ساتھ فنِ خطاطی کا احیا بھی ہوا ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک 12 صوبوں میں 23 کیلی گرافک سینٹرز کھولے جاچکے ہیں۔

کونسل کی ان سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے پروفیسر سیف الدین سوز نے ارجن سنگھ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بجا کہا کہ

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

سوز صاحب نے کونسل کی موجودہ گرانٹ کو اور زیادہ بڑھانے کا مطالبہ بھی کیا۔ کیوں کہ اتنے سارے ہمہ جہت پروگراموں کے لیے یہ فنڈ قطعی ناکافی

ہے۔ جناب ارجن سنگھ نے اپنی تقریر میں ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اردو والوں کی دکھتی رگ کو یہ کہہ کر چھیڑ بھی دیا کہ ہم تو ہر ممکن تعاون دیں گے ہی لیکن اردو والے خود بھی تعاون کریں۔ بدقسمتی سے یہی اردو والوں کا کمزور پہلو ہے۔ ان کے یہاں تعاون حق تو ہے لیکن فرض کا خانہ بالکل خالی ہے۔ اس لیے پروفیسر مسعود حسین خاں کی اس بات میں بہت جان ہے کہ "ہم اردو والوں نے اردو کی جنگ اپنے گھروں کے آنگنوں میں ہاری ہے۔"

اس بار میلے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ امریکی سفارت خانے کی طرف سے نکلنے والے اردو رسالے اسپین کی طرف سے ایک کوئز کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ آخری دن پانچ انعامات پہلی پانچ پوزیشن لانے والوں کو دیے گئے جو جریدے کے پبلشر جناب مائیکل اینڈرسن نے اپنے ہاتھوں سے تقسیم کیے۔

قومی اردو کونسل کے ذریعے سجائی گئی اس محفل میں کچھ تلخ حقیقتیں بھی کھل کر سامنے آئیں مثلاً علاقے کے متعدد اسکولوں کے طالب علم اور اساتذہ کم نظر آئے۔ جس کی ایک وجہ تو امتحانات ہو سکتی ہے لیکن بڑی وجہ عدم دلچسپی تھی کیوں کہ جہاں ایک طرف اوپن ایئر تھیٹر جامعہ کے طلبہ سے بھرا نظر آیا وہیں کتابوں کی دکانوں پر کم لوگ نظر آئے گویا ساری دلچسپی ثقافتی پروگراموں سے تھی، کتابوں سے نہیں۔ احقر نے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا گرد و نواح کے اسکولوں کے سربراہوں نے اپنے اداروں کے بچوں کو اسکول کی طرف سے بھیجنے کی کوشش کی تو معاملہ الٹا نظر آیا جبکہ ان کی طرف سے ادنا سی دلچسپی خوشگوار اثرات ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ میلے کی رونق بھی بڑھا سکتی تھی۔

مطالعے اور کتب بینی کے ذوق کی آبیاری کے لیے استاد کی ذات سب سے اہم وسیلہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے غلط نہیں کہا تھا کہ شاگرد کے لیے بہترین کتاب استاد ہے۔ کتابوں کے تئیں استاد کا شغف اس کے شاگردوں پر بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے لیکن آج کا المیہ ہے کہ استادوں میں بھی یہ شوق معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ بحران بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ میلے میں اساتذہ یا تو کم نظر آئے یا پھر خالی ہاتھ لوٹتے نظر آئے۔

راقم السطور نے سائنس داں اور رسالہ سائنس کی دنیا کے اڈیٹر جناب اسلم پرویز سے جب فروخت اور رسالے کی ممبر شپ کے بارے میں دریافت کیا تو ان کا جواب تھا کہ پڑھے لکھے علاقوں میں خریدار کہاں ہیں؟ ان کا تجربہ یہ تھا کہ فروخت کے لحاظ سے لال قلعے والے پہلے دو میلے زیادہ بہتر تھے۔ میرا ذاتی مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے۔ بہر حال یہ تو کونسل کے ذمے دار ان ہی بتائیں گے پہلے "میلوں (دہلی میں منعقدہ) سے پچھلے میلے میں فروخت کم تھی یا زیادہ۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے بتایا کہ اس کتاب میلے میں بیس لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

میلے میں سائنس اور تکنیکی کتابوں کی تعداد کم تھی۔ دینی اور تنقیدی، شعر و شاعری سے متعلق کتابوں کی بھرمار تھی۔ دینی کتب کے مقابلے میں ادبی کتب کی فروخت کم ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں عام قاری کی دلچسپی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ دینی کتب کے مقابلے میں دوسری کتابوں کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں جو عام قاری کی پہنچ سے دور تھیں۔

اردو میں ادب اطفال کی بے حد کمی ہے۔ بچوں کے رسالوں کی تعداد دیکھیے تو وہ بھی گنے چنے جیسے دہلی سے نکلنے والے تین ماہناموں امنگ، پیام تعلیم، نرالی دنیا کے علاوہ چند ہی رسائل ایسے ہیں جن کے نام لیے جا سکتے ہیں جیسے بزم اطفال (مالیگاؤں)، گل بوٹے (ممبئی)، بچوں کا ہلال (رامپور) نور (رامپور) اچھا ساتھی (بجنور) وغیرہ ان میں بھی دو تین کو چھوڑ کر مقبولیت اور اشاعت کے سلسلے میں تہی مایہ نظر آتے ہیں۔ میلے میں مشکل سے تین چار اسٹال ایسے تھے جہاں سے بچوں کی کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ قومی کونسل کا بچوں کا اسٹال، چلڈرن بک ٹرسٹ، مکتبہ جامعہ یا ملک بک ڈپو۔ کونسل کے اسٹال پر تین سو سے زیادہ کتابیں تھیں لیکن اس میں بھی مشکل سے 70 تا کمل طبع زاد تھے باقی تراجم تھے جو اردو کونسل نے دوسری زبانوں سے کرائے تھے۔ بھٹ صاحب کے دور میں اس سمت میں بھی کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ اچھا ہوتا کہ تراجم سے زیادہ توجہ اردو میں بچوں کے لیے کتابیں اردو مصنفین سے لکھوائی جاتیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے اردو ادب میں اس پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ کونسل کی جانب سے ایسے مصنفین کی ترجیحی بنیاد پر حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ مکتبہ جامعہ اس پہلو پر زور دیتا رہا ہے، لیکن وہاں بھی اب تھکن کے آثار نظر آتے ہیں۔ چلڈرن بک ٹرسٹ بھی اردو کے معاملے میں اتنا فعال نظر نہیں آتا جس کا بڑا سبب اردو کتابوں کی کم فروخت ہو سکتا ہے۔ اردو پرائمری اسکولوں اور مکاتب کی خصوصی کوششوں اور کتب خانوں میں ایسی کتابیں مہیا کر کے ہی اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف کتابوں کی فروخت میں اضافہ ہوگا بلکہ نئے لکھنے والوں کو بھی حوصلہ ملے گا۔

کتابوں کا مستقبل کتب خانوں سے وابستہ رہا ہے۔ تحصیل علم میں کتب خانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ تر کتب خانوں میں کتابوں پر پڑی دھول اور ان کی زرد روئی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا پرسان حال کوئی نہیں، ایسے ماحول میں کتابیں آتی بھی ہیں تو صرف دیمکوں کی خوراک بننے کے لیے۔ طالب علموں میں جب تک مطالعے کا ذوق پیدا نہ ہوگا تب تک کتب خانوں میں ہو کا عالم طاری رہے گا۔ ہمارے ماہرین تعلیم کو اس پہلو پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ آج کا طالب علم ہی کل کا قاری ہوتا ہے۔ اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک کتب خانوں کے لیے اچھا خاصا فنڈ مختص ہوتا ہے لیکن اس مد میں خرچ کے سلسلے میں اس پر دھیان نہیں دیا جاتا کہ کتابیں ایسی خریدنی چاہئیں جو کتب بینی کے ذوق میں اضافہ کر سکیں۔ بد

نستی سے ہوتا یہ آیا ہے کہ چالاک اور بارسوخ ناشر اور کتب فروش اپنی بیکار کتابیں لائبریریوں کے سر منڈھ دیتے ہیں جس سے پڑھنے والوں میں مزید بددلی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اردو کتاب میلے کے سلسلے میں مہاراشٹر کا تجربہ بیان کرنا بے موقع نہیں ہوگا۔ خاکسار نے سی ایس آئی آر کے اردو رسالے سائنس کے سینئر سیلز ڈسٹری بیوٹر نسیم اختر سے ان کے ممبئی میلے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ مہاراشٹر والے تو اردو کے دیوانے ہیں۔ یہی والہانہ لگاؤ تو ہے جس کے باعث اردو کے سلسلے میں سب سے قابل اطمینان صورت حال مہاراشٹر کی ہے۔ پورے غیر اردو صوبے میں 360 معیاری اردو میڈیم اسکولوں کی موجودگی ان کے والہانہ لگاؤ کا ثبوت ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف شمالی ہندستان (اردو کا گہوارہ) میں اردو کی زبوں حالی سے سبھی واقف ہیں۔

بہر حال اپنے حال میں مست ہمارے دانشور اردو کی صورت حال سے کتنے بھی مطمئن نظر آئیں اصل کیفیت وہی ہے جس کا بجا ادراک کر کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اپنی کوششوں کی لو تیز تر کی ہے۔ ان کی عملی اور حقیقت بیں نظروں نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ ہم نے اردو کی جنگ عمل کے میدان میں ہاری ہے سو اس کا حل بھی عمل کے میدان میں ہی ممکن ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم میں ایک دیدہ ور تو ایسا ہے جسے مسائل کے ساتھ ساتھ لائحۂ عمل کا شعور بھی ہے۔ ہمیں قومی اردو کونسل کو رول ماڈل مانتے ہوئے اس کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل کر اپنی زبان کا کھویا ہوا وقار اور افادیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یقینا حالات موافق نہیں ہیں لیکن خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہو کر اردو کے راستے میں حائل پتھروں کو کچھ تو کم کیا ہی جا سکتا ہے۔ کسوٹی کتابوں کی تعداد نہیں بلکہ اردو قارئین ہونے چاہئیں اور یہ کہ اردو کو کہاں تک ہم موجودہ دور کے مسائل سے جوڑ پاتے ہیں۔ □□□

17,Baitur Reham, Ghafoor Nagar, Okhla,
New Delhi - 25

بدھ کی کہانیاں

مصنف: اچا کمہر

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80، قیمت: -/65 روپے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی ایل ایل جیا پرداہ، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیو رائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپے

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی آر. گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہو گئے بلکہ اس کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت: -/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

حبیب حق

ہماری مطبوعات "کلاسیکی یونان: تہذیب، فلسفہ، فنونِ لطیفہ" سے اقتباس

فنِ المیہ نگاری

......المیہ ایک ایسے عمل کی نمائندگی ہے جو سنجیدہ توجہ کے لائق بذاتِ خود مکمل اور مخصوص حجم کا حامل ہو۔ اس کی زبان ہر طرح کے صنائع بدائع سے مزین ہوتی ہے، ......اُس کی ہیئت بیانیہ نہیں بلکہ عملیہ ہوتی ہے اور یہ دردمندی اور خوف کے ذریعے اُن جذبات کی اصلاح اور مناسب تنقید کرتا ہے...... سیزری اور آرائش المیہ کا حصہ ہوں گے...... گیت اور ڈکشن بھی...... المیہ کسی عمل کی نمائندگی کرتا ہے......المیہ کا مقصد واقعات اور پلاٹ کو پیش کرنا ہے......

ارسطو

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے عظیم ترین المیہ ڈراما نگار چار گزرے ہیں جن میں تین یونانی ہیں۔ المیہ نویسی یونانی ادب کا مایہ ناز فن تسلیم کیا گیا ہے۔ تین عظیم یونانی المیہ نگار ایسکی لیز، سوفوکلیز اور یوری پیڈز ہیں (چوتھا شیکسپیئر ہے جو ان سبھوں سے برتر ہے)۔ ان المیہ ڈراموں کی بدولت یونانی ذہن اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں کہ اُس کے ذریعے وہ اپنی داخلی اور جس عمیق کو فزوں تر کر گیا اور جس کے ذریعے اپنے ماحول کو سمجھنے کی سعی کی۔ المیہ نگاری یونانیوں کے دل کی آواز تھی۔

(2)

یونانی اس دنیا کو کھلی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ سکے اور اس دنیا کے حُسن بے پناہ کا نظارہ کر سکتے تھے۔ اس خصوصیت نے فنونِ لطیفہ کی تخلیق پر انھیں مجبور کیا۔ اُن کی تخلیقیں ژولیدہ بیانی سے پاک، صاف ستھری اور اُن قیمتی لوازم سے نقش ہوا کرتی تھیں جو کہ اُن کا خاصہ تھیں۔ اُن کا ایمان تھا: حُسن حق ہے اور حق حُسن۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور اُن سے پیداشدہ کنفیوژن سے عہدہ برا ہونے کی خاطر فنونِ لطیفہ کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ داخلی مسرت یا سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک قسم کی جادوگری ہے (یا شعبدہ بازی)۔ ایک ذہنی سکون ہے، راحت پانے کا ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ یہ ویژن اُس حقیقت کے نزدیک لے جاتا ہے جو غیر مکمل ہونے پر بھی حیرت انگیز اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کی شاعری دراصل اُن کی غیر مرئی (یعنی لافانی) قوتوں سے جنگ کرنے کا دوسرا نام ہے جس کی بدولت وہ سعادت کے اعلا مرتبے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ شاعری حُسن ہے، حق ہے اور انبساط کا ذریعہ۔

(3)

المیہ نگاری یونانیوں کی اختراع تھی۔ تجریدی طور پر موجود خیر، شر، مختلف و گوناگوں ہستیاں ضرور موجود تھیں لیکن المیہ نگاری کی بدولت ان میں جان پڑی اور وہ انسانی تصورات، تعلیمات اور کش مکش کا حصہ بن گئیں۔ کہا گیا ہے کہ نطشے کی روح شاعری کی روح سے ملی اور المیہ کی پیدائش ہوئی (حالانکہ تمام عمر اس تصور کو رد کرتا رہا)۔

قدیم یونان میں دیوتا نما ہیرو اور ہیرو نما دیوتا ٹرائے کے کھلے میدانوں میں نبرد آزما ہوئے اور اس فانی دنیا میں جہاں ہر شئے حُسن سے معمور اور ایک اُمنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُن کا ٹکراؤ شاعری کی بدولت جنسی سطح پر آ گیا اور یوں المیہ شاعری وجود میں آئی۔ پھر ایک نئی فکری دنیا آباد ہوئی جہاں کہ محض گیت اور کہانی کافی نہ سمجھی گئی بلکہ اسے ایک ایسا عہد وجود میں لایا تھا جسے سمجھنا اور وضاحت کرنا ضروری تھا۔ اسی دنیا میں المیہ نے جنم لیا۔ درد یا دُکھ جو ساری کائنات میں جاری ہے، المیہ شاعری اسے نہ صرف ایک ایسے مقام تک لے جارہی ہے جہاں ہم اُس کیفیت سے نئے انداز پر اثر پذیر ہوتے ہیں بلکہ یہ شاعری درد کی ایک آفاقی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ المیہ ہمیں درد سے روشناس کراتا ہے اور ساتھ ساتھ ایک لذت بخشتا ہے جو ہمیں جانبِ منزلِ سعادت لے جانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایسکی لیز کے "پرومے تھیس" میں سب سے اہم کردار وہ ہے جو معصوم و مصیبت زدہ ہے لیکن اس عمومی رشتے کے باوصف یہ جذباتی باغی جو اعلا دیوتا اور دوسری کائناتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ انٹی گونی اس بات پر مصر ہے کہ اس کے بھائی کی مناسب تجہیز و تکفین ہو۔ ایڈی پس کی بربادی ہمیں انسانی کیفیت کے ایک مخصوص المیے سے روشناس کراتی ہے۔

(4)

عالمی ادب کی تاریخ میں صرف دو دور ایسے آئے جہاں واقعی طور پر المیہ نگاری ظہور میں آئی۔ اوّل پیری کلیز اتھینز اور دوسرا الزبتھ اوّل کا لندن۔ دونوں عہدوں میں ایک ہی طریقے اور ایک ہی فیشن اظہارِ ذات میں مشغول رہے۔ دونوں عہد نہ تو آزمائش کی گھڑیوں میں سے تھے اور نہ شکست کی۔ ان زمانوں میں زندگی ایک اجنبی شراب کی سی تھی اور کوئی بھی بڑھ کر جام اٹھا سکتا تھا اور بدمست ہوسکتا تھا۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی واضح صلاحیت موجود تھی۔

● قدیم یونان میں جتنے عالم اور فلسفی گزرے ہیں شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں اتنے عالم اور فلسفی پیدا ہوئے ہوں۔ ہومر، ڈیموکریٹس، فیثاغورث، ہپوکریٹس، سوفوکلیز، یوری پیڈز، سقراط، افلاطون اور ارسطو اور نہ جانے کتنے مشاہیر یونان میں پیدا ہوئے اور پوری دنیا کو اپنی فکر اور فلسفے سے متاثر کیا۔ اس کتاب میں 700 قبل مسیح سے سکندر اور ارسطو کی موت تک کے یونانی کلاسیکی دور کی تہذیب، فلسفے اور فنونِ لطیفہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 248 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/127 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر اساتذہ اور طلبہ کو 40 فیصد رعایت دیتی ہے۔

بنی نوع انسان کو کھلنے پھولنے کے سارے مواقع حاصل تھے۔ غالباً ایسے ہی دور میں آلام کو ایک مخصوص طور پر سمجھا جاسکتا تھا۔ یوں کہیں ایک طرز کی صوفیانہ فکر کو فروغ دیا جاسکتا تھا جب زندگی کی شراب سے سیر ہوکر، ماضی کی صعوبتوں اور مستقبل کے کرب پر غور کیا جاسکتا ہے۔ احساس ہونے لگتا ہے کہ تقدیر اور دیوتا دونوں مل کر زندگی کی ننھی سی کشتی کو موجوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں اور زندگی اُبھر اُبھر کر ان موجوں سے ہوکر گزرنا چاہتی ہے۔ موجوں سے جنگ کرنے میں انبساط کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ جذبات اُمڈ اُمڈ کر بڑھاوا دیتے ہیں اور موجوں سے دور دوسرے محفوظ کنارے پر سعادت کی قندیل روشن دکھائی دیتی ہے۔

ہر شاعر عموماً ہر المیہ شاعر خصوصاً زندگی کا راز کائنات میں اُس کی ضرورت و اہمیت کو جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ المیہ کو جاننا ہے کہ انسانی زندگی کی کشمکش اُس کا کائنات اور دیگر ہستیوں سے ٹکراؤ، سعادت کی خواہش، بے ثباتی، دنیا سے پاک ہونے کی ضرورت ساری باتیں سمٹ سمٹا کر الیاتی نوحہ گری کو جلا دیتی ہیں۔ المیہ شاعروں کو ایسا احساس گہرا ہوتا ہے کہ زندگی حصار میں مقید ہونے والی شے نہیں، اسے تڑپ کر، باہر نکل کر، بے ثباتی سے ثبات کی جانب سفر کرنا ہے۔

چوں کہ یونانیوں نے کبھی بھی اُس ایرانی تصور کو گلے سے نہیں لگایا کہ خیر وشر کے ابدی معرکے میں کبھی کبھار شر کی فتح ہوجایا کرتی ہے یا یہ کہ شر وہ شئے ہے جس سے خیر کو ابدی خدشہ لگا رہا کرتا ہے چنانچہ اُن کے لیے المیہ کا مسئلہ اتنا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ مسئلہ زیست کی بے پناہیوں، بوالعجبیوں، پُر اسراریت اور وسعت کا تھا، روز وشب کے مسئلہ کا تھا، بدلتے ہوئے لوگوں کا مسئلہ تھا، دیوتاؤں سے عفو و درگزر کا معاملہ تھا۔ کائنات کو پُر اسرار ضرور تھی پر انسان کا بُرا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے سارے جوڑنے والے ڈورے موجود تھے کہ گاہے گاہے آپس میں اُلجھ جایا کرتے تھے۔

موت بذاتِ خود ایک المیہ تسلیم نہیں کی گئی، نہ تو حسین نوجوانوں کی موت یا دلکش محبوب ہستیوں کی موت۔ موت قانیوں کی تحت ہے لیکن فانی ہستیاں خود کو صعوبتوں، دشواریوں، مجبوریوں، ذلت اور خواری سے گزر کر خود کو وہاں لے جاسکنے کی قوت پیدا کرسکتی ہیں جہاں لافانی ہستیاں اُن کا استعمال کرسکتی ہیں۔ المیہ یونانیوں کے ہاں اس امر میں پنہاں ہے کہ ایک روح کیوں کر، اور کس حد تک، صعوبتیں برداشت کرتی چلی جاتی ہے اپنے اُس عاشقانہ ختم ہونے والے سفر میں جو اسے سعادت کی منزل تک لے جاتی ہے۔

□□□

دھوپ چولھا

مصنف: ایم۔ایم۔ہڈی/مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے
کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں
ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
"کیمیا کی کہانی" میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم
اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولس ورن/مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی
ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے
کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ
کردی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور
ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں بڑے
دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہائیڈرا،
جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ
کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مصنف: محمد مجیب

ہماری مطبوعات

"ہندستانی مسلمان" سے اقتباس

مترجم: محمد مہدی

سیاسی نظام

ہندستان دنیا کا ایک بڑا ملک ہے۔ یہ مشرق شمال اور شمال مغرب میں پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور دوسری طرف خلیج بنگال اور بحیرہ عرب ہے۔ قدرتی سرحدیں تنہائی پیدا کرسکتی ہیں اور تحفظ کا ایک غلط احساس بھی۔ ان دونوں چیزوں کی وجہ سے ہندستان کے لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ خیبر قرم اور لولان کے درّے قدرتی دیوار میں خطرناک رخنے ہیں اور ساحل اتنا طویل ہے کہ سمندری دشمن کا قبضہ ہو تو اس کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ ملک کی جغرافیائی خصوصیات خود تین بڑے قدرتی حصوں کا پتہ دیتی ہیں شمال کے میدان، دکن کی سطح مرتفع اور تنگ بھدر اور پینار دلیاؤں کے جنوب کا علاقہ جو بذات خود کوئی یکساں جغرافیائی اکائی نہیں ہے ان بڑے علاقوں کو جغرافیائی اعتبار اور سیاسی اعتبار سے چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور یہی وہ خاص وجہ ہے کہ ہندستان کی سیاہ تاریخ میں واقع المرکز اور مائل بہ مرکز رجحانات کے درمیان برابر تصادم ہوتا رہا ہے۔

ریلوے انجن اور دخانی جہاز کے آنے تک غالب معاشی حقیقت یہ تھی کہ ہندستان دو بین الاقوامی تجارتی راستوں کے درمیان واقع ہوا تھا۔ شمال میں چین۔ مغربی ایشیا تک ریشمی سڑک، جنوب میں جنوب مشرقی ایشیا اور بحیرۂ روم کے ملکوں کے درمیان مسالوں کی تجارت کا راستہ۔ اندرونی تجارتی راستے شمال میں ریشمی سڑک سے، وسط میں سندھ، گجرات اور بنگال کی بندرگاہوں سے جڑے تھے۔ دکن کے پاس مغربی اور مشرقی ساحلوں تک پہنچنے کے اپنے راستے تھے لیکن وہ گجرات کی بندرگاہوں سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا۔ جنوب قریب قریب پوری طرح آزاد تھا تجارتی راستوں کی سمت بتاتی ہے کہ بیرونی دنیا کے ساتھ معاشی روابط کے نقطۂ نظر سے بھی ہندستان کی تین اکائیاں تھیں اور چونکہ ان میں سے ہر ایک میں اشیاء تجارت بالکل مختلف تھیں اس لیے تجارتی روابط قائم رکھنے یا انھیں فروغ دینے کے لیے تینوں اکائیوں کا سیاسی انضمام ضروری نہیں تھا۔

ہندستان اور اسلامی دنیا کے درمیان پہلا ربط جنوب میں قائم ہوا۔ کیوں کہ عرب اور ہندستان کے درمیان مدت مدید سے تجارت ہورہی تھی۔ تجارتی مفاد ہی کے لیے آٹھویں صدی کے شروع میں سندھ کو عربوں نے فتح کیا۔ اس کے بعد ہندستان پر مسلم اثرات میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ 1206 میں آزاد سیاسی اکائی کے طور پر دہلی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد پانچ سو برس سے زیادہ مدت تک مسلمان سیاسی طور پر غالب رہے اور انگریزوں نے دراصل انھیں کے ہاتھوں سے ملک کی حکومت چھین لی۔

یہاں ہمارا مقصد اس عہد کی سیاسی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے جسے مسلم یا قرون وسطی کا عہد کہا جاتا ہے۔ ہم اس تاریخ پر نظر ڈالیں گے نظم و نسق، دفاع، فوجی تنظیم اور مدنی روؤں کے نقطۂ نظر سے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ پورا سیاسی نظام کس طرح کام کرتا تھا۔ اس طرح سے ہم ایسا پس منظر قائم کرسکیں گے کہ ہندستانی مسلم سیاسی تاریخ کے ابتدائی، وسطی اور جدید دور کے نمائندہ ہندستانی مسلم مدبّروں اور نظم و نسق چلانے والوں کا مطالعہ کرسکیں۔

ہندستان میں مسلم ترک حکومت کا قیام صرف ایک کامیاب حملہ نہیں تھا کہ بس حملے کے بعد جس علاقے کو فتح کرلیا اس پر مستقل قبضہ قائم رکھنے کی تدبیریں کی جائیں۔ یہ لازمی نتیجہ تھا اس حرکت و نقل مکانی کا جو وسطی ایشیا کے لوگوں میں واقع ہورہی تھی اور نظریاتی اعتبار سے یہ تصادم تھا دو تہذیبوں کا جو کئی اعتبار سے نظام زندگی اور نظام فکر میں ایک دوسرے کی مخالف تھیں۔ عام طور پر انھیں مسلم اور ہندو تہذیبیں کہا جاسکتا ہے لیکن ٹھوس طور پر انھیں بارھویں اور تیرھویں صدی میں ترک اور راجپوت کہا جاسکتا ہے۔ تہذیبوں کے درمیان اختلافات کو اصولوں کی بنیاد پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عمومیت سے بچنے کے لیے ہم انھیں سیاسی تنظیم اور سماجی نظام کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔

ہم جس عہد کا ذکر کررہے ہیں اس میں ہندستان کی سیاسی اور سماجی تنظیم کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ورن (ورن) (جات پات) کا نظام۔ یہاں ہمارے

● چند مثالوں کو چھوڑ کر ہندستان کے مسلم مورخین نے ایسی معروضیت کی کبھی کوشش نہیں کی جس کی بدولت تاریخ کی بہتر سمجھ بوجھ پیدا ہوسکے۔ اس کتاب میں ہندستانی مسلمانوں کو صحیح تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف محمد مجیب ہیں اور اس کا اردو ترجمہ محمد مہدی نے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 812 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 258 روپیے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر اساتذہ اور طلبہ کو 40فیصد رعایت دیتی ہے۔

لیے یہ فیصلہ کرنا قطعاً غیر ضروری اور بے معنی ہے کہ یہ کب اور کیسے ظہور میں آیا۔ اصولاً اور عملاً یہ تمام واجبات پر حاوی تھا۔ فکر اور عمل پر اس کا اثر فیصلہ کن تھا۔ اس نے حکمراں کے فرائض اور مراعات کی نشان دہی کی اور حکومت کے مقاصد اور طریقوں کا تعین کیا۔ اس میں نجی اور پبلک قوانین موجود تھے۔ اس نے سماجی اور معاشی زندگی کے کردار کو اس طرح متعین کیا کہ تمام سرگرمیوں کو یوں تقسیم کردیا۔ (ا) حصول علم اور رسوم کی رہنمائی (ب) حکومت اور جنگ (ج) تجارت وحرفت اور (د) ملازمت۔ راجپوتوں کی سیاسی تنظیم اسی نظام پر بنی تھی۔ جات اور حق وراثت دونوں ہی کے ذریعے حاکم کی حیثیت کی توثیق ہوئی تھی۔ یہی بات اس کے تابع سرداروں پر لاحق ہوتی تھی۔ جو اسے اپنا سردار اعلا مانتے تھے۔ خاندانوں میں جنگ ہوسکتی تھی لیکن ایک ریاست کے اندر تاج ان لوگوں کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا تھا جو زیادہ مہم جو اور اہل ہوتے تھے۔ خود حکمرانوں کے حوصلوں کی بھی حدیں مقرر کردی گئی تھیں۔ (راجہ) کو چاہیے کہ اپنے قریبی پڑوسی اور (ایسے) دشمن کے طرف داروں کو اپنا مخالف تصور کرے اپنے دشمن کے قریبی پڑوسی کو اپنا دوست تصور کرے اور ان دونوں کے باہر جو (راجہ ہو) اسے غیر جانبدار تصور کرے۔ تین قسم کے مارگوں کو صاف کرنے اور اپنی شش پہلو فوج کو (کارگر بنانے کے بعد) اسے چاہیے کہ دشمن کی راجدھانی کے خلاف جنگ کے لیے اس طرح بڑھے جس کی ہدایت کی گئی ہے۔ وہ جب اپنے دشمن کو (ایک شہر میں) محصور کرلے تو خود اپنے کیمپ میں بیٹھے۔ اس کی سلطنت کو پریشان کرتا رہے۔ اس کی گھاس، غذا، ایندھن اور پانی کو برابر تباہ کرتا رہے، لیکن تمام (شکست خوردہ) لوگوں کی خواہش پوری طرح معلوم کرنے کے بعد اسے چاہیے کہ (مفتوح حکمراں) کے ایک قرابت دار کو تخت پر بٹھائے اور اپنی شرائط عائد کرے۔

گویا ایک حکمراں کو حق تھا کہ وہ جنگ کرے اور اپنے اقتدار اور اپنے علاقے کو وسعت دے کر اپنی غالب حیثیت منوائے۔ لیکن جنگوں کے ذریعے عام طور پر کوئی بڑی سیاسی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کے تاجر اور سیاح سلیمان نے لکھا ہے ''کبھی کبھی ہندستانی فتوحات کے لیے جنگ کرتے ہیں لیکن ایسے موقعے کم ہوتے ہیں۔ جب کوئی بادشاہ پڑوس کی ریاست کو فتح کرلیتا ہے تو شکست خوردہ بادشاہ کے خاندان کے کسی فرد کو وہاں کا حاکم بنا دیتا ہے جو فاتح کے نام پر حکومت چلاتا ہے۔ عام باشندے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ برداشت نہیں کرتے اس طرح سیاست اور جنگ کے ذریعے سربراہی کی توسیع ہوتی تھی لیکن نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔

شمالی ہندستان جس بے شمار سلطنتوں میں تقسیم تھا وہ خود بے شمار علاقائی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں جہاں چھوٹے چھوٹے سردار اور حاکم حکومت کرتے تھے۔۔۔ خود اپنے علاقوں میں تو انھیں وقتی خودمختاری حاصل تھی لیکن یہ جاگیردار سردار ایک قسم کے حلف وفاداری کے ذریعے اپنے غالب سردار کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور توقع کی جاتی تھی کہ جنگ چھڑنے پر یہ لوگ اس کی مدد کریں گے۔ یہ جاگیر والے ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے تھے اور اپنی مغلوب حیثیت پر خوش نہیں رہتے تھے۔ جب بھی۔۔۔۔۔۔ غالب سردار کا ستارہ گردش میں آتا تھا تو جاگیرداروں میں جو زیادہ طاقت ور ہوتے تھے۔ وہ غلامی کا جوا اتار پھینکتے تھے اور ان کے پڑوس میں جو چھوٹے چھوٹے محکوم ہوتے تھے انھیں اپنی وفاداری تبدیل کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

ایسے سیاسی نظام میں ریاست کے پورے وسائل کبھی بروئے کار نہیں آتے تھے۔ اشخاص کے اعتبار سے وہی لڑتے تھے جنھوں نے لڑنا اپنا پیشہ بنایا تھا لیکن نتیجہ جو بھی نکلے باقی کی آبادی پر اس کا کوئی بہت زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا۔ اوپر جس شش پہلو فوج کی تقسیم کا ذکر کیا گیا وہ ان پر مشتمل تھی۔ حکمراں کے وہ فوجی جو نسلاً بعد نسلاً سپاہی تھے۔ پیسے کی خاطر لڑنے والے، پیشہ ورانہ تنظیموں پر محصول۔ غالبًا ان پیشہ ورانہ تنظیموں کے لوگ جن کی مہارت میں جنگ کرنا بھی شامل تھا۔ تابع جاگیردار اور اتحادی، دشمن کے مقبوضہ سپاہی یا توڑے ہوئے سپاہی اور بن باسی قبائل۔ جب بہت ضرورت پڑتی تھی تب بھی غیر فوجی جاتوں میں سے لوگ بھرتی نہیں کیے جاتے تھے اور نہ عام طور پر انھیں فوجی ملازمت کی اجازت تھی۔ وسائل کے معاملے میں بھی ریاست اپنے کنٹرول کو پھیلا نہیں سکتی تھی چاہے غیر معمولی وسائل کا مطالبہ ہی کیوں نہ کیا گیا ہو یا اس پر سمجھوتہ کیوں نہ ہوا ہو۔ برادری کی یک جہتی سیاسی تنظیم پر نہیں جات پات کے نظام پر قائم تھی۔

دیہی علاقوں میں چھوٹے یا بڑے قبائلی گروہ آباد تھے۔ آریوں کی آبادی کے ابتدائی دور ہی سے ہمارے پاس اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ ہر گاؤں کی خواہش تھی کہ وہ خود کفیل ہو۔ خود مکتفی اکائی بنے جو مسلح حملے کے خلاف اپنی حفاظت کرسکے۔ گاؤں یا کئی گاؤں پر مشتمل ایک گروہ ایک قبائلی اکائی بھی تھا۔ جس کی تنظیم اور ملحقات کا کردار قبائلی تھا۔ تقریباً پورے مسلم دور میں دیہی علاقوں پر سرداروں کا غلبہ تھا جنھیں عہد سلطنت کے وقائع میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے جیسے رائے، رانا، راوت، مقدم، کھوٹ۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہوسکے اپنی آزادی برقرار رکھیں۔ جب یہ ناممکن ہوجاتا تھا تو پھر وہ ان شرطوں کو قبول کرتے تھے جن پر انھیں مجبور کیا جاتا تھا اور ہر موقعے سے فائدہ اٹھا کر کوشش کرتے تھے کہ مسلم نظم ونسق کے جال سے الگ ہوجائیں۔ ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی قوت کی نمائندگی کرتے تھے جو آزادی کے لیے مسلسل کوشاں تھے۔ لیکن اگر قبائلی گروہ اور ان کے موروثی

لیڈر زندگی اور فکر کے معیار مقرر کر پاتے تو سیاسی، سماجی یا تہذیبی اعتبار سے ہندستان ترقی نہ کر پاتا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب ایک شہری تہذیب تھی۔ اس دور کی شہری زندگی اور مفادات کم سے کم مشرقی ہندستان میں آریوں کے مرغزاری کلچر کو جھیل لے گئے اور موریہ اور گپت ادوار کی نمایاں خصوصیات بن گئے۔ اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں سندھ میں بڑے بڑے تجارتی شہر تھے۔ اور شمالی ہندستان میں مندروں کے شہر تھے جن کی صنعتوں اور دولت کی بڑی شہرت تھی لیکن گپت سلطنت کے زوال کے بعد شہری تہذیب میں زوال آیا اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ دہلی سلطنت کا قیام شہری تہذیب کا احیاء تھا۔

یہ تھی ہندستان کی سیاسی اور سماجی تنظیم گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں باہر سے آنے والا مسلم کلچر جس کی نمائندگی ترک کرتے تھے کئی معنوں میں اس کے بالکل برخلاف تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کے مطابق جو ان کے سماجی آدرش کا آئینہ دار تھا وہ ایک مذہبی برادری تھے جس کے افراد کو مساوی حقوق اور مساوی درجہ حاصل تھا ملت کے مفادات اور ضروریات کو فرد کی ضروریات اور مفادات پر مکمل سبقت حاصل تھی۔ ان سے ہر قسم کی قربانی کا مطالبہ کیا جاسکتا تھا اور اسے پورا کرنا پڑتا تھا۔ یہ حکم کہ اپنے سچے دین کی بقا کے لیے ہتھیار اٹھانا فرض ہے اس نے ہر تندرست مسلمان کو امکانی فوجی بنا دیا کیونکہ اس حکم کے عمل درآمد پر پیشے یا اہلیت کی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی تھی۔ یہ تھا مذہبی عقیدہ۔ لیکن قانون کے مطابق جو بتدریج پیدا ہوا مسلم ملت مشتمل تھی۔ حاکموں اور محکوموں پر۔ اور حاکموں کو یہ اختیار تھا کہ مذہب نے جو اختیار مجموعی حیثیت سے پوری ملت کو دیا تھا وہ اس کو استعمال کریں۔ حاکم کے اختیار کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آج ہندستان میں حاکم اعلا اور جاگیری حقوق کا جو طریقہ ہے اس قسم کا کوئی نظام قابل قبول نہیں تھا۔ کیوں کہ اس سے حاکم کا مفاد اور انتظامی کارکردگی دونوں مجروح ہوتی تھیں۔ مسلمان حاکم کا اختیار مذہبی عقائد کے معاملات تک نہیں پہنچتا تھا لیکن سیاست کے میدان میں وہ عملاً آزاد تھا اور اس طرح کے تمام اشخاص، تمام وسائل، تمام سرگرمیاں اس کے قبضۂ اختیار میں تھیں۔

راجپوتوں کا جو سیاسی نظام تھا اس کا ترکوں کے مقابلے میں ٹھہرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن جلد ہی نئی ریاست کو اپنے تمام وسائل کو مجتمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چونکہ یہ وسائل تقریباً تمام تر زرعی تھے۔ اس لیے ریاست کے لیے ضروری تھا کہ وہ دیہی علاقوں تک اپنے اختیار کو وسعت دے اور اس میں شدت پیدا کرے۔ یہاں اسے دیہی سرداروں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور یہ کشمکش طویل اور سخت تھی۔ یہ سردار کئی معنی میں کمزور تھے لیکن ایک ایسی زبردست وجہ تھی کہ وہ اس کشمکش کو طول دے سکے اور وہ یہ کہ مسلمان ایک شہری تہذیب کی نمائندگی کرتے تھے۔ دیہی زندگی میں ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ گاؤں ایک ذہنی اور سماجی زنداں ہے۔ انھوں نے بہت سی صنعتوں پر قبضہ کرلیا لیکن زراعت پیشہ کے اعتبار سے زمین پر کسی قابل ذکر تعداد میں نہیں بس سکے۔ اس لیے یہ لوگ اپنی ریاست کے لیے وہ ذریعہ نہ بن سکے جس کے سہارے ریاست دیہی سرداروں کی مدافعت کو توڑ سکتی۔ شہری اور دیہی آبادیوں کے درمیان کسی قسم کے رواجی اور جذباتی رشتے تھے ہی نہیں۔ یہ دونوں تقریباً اخیر تک ایک دوسرے سے بیگانہ رہے اور اس کی وجہ سے اس تصادم میں اور تلخی بڑھی۔

یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس دور کی مسلم حکومت ان طور طریقوں پر مشتمل ہوتی تھی جو ایک سلطان اپنی سلطنت کے نظم و نسق کے لیے اختیار کرتا تھا۔ مذہبی قانون، سیاسی فکر اور حکمرانوں کی قائم کی ہوئی مثالیں یہ سب چیزیں مل کر اسے حکومت کرنے کی ذمّے داری دیتی تھیں اور ایسی آزادی دیتی تھیں جو خود اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اپنی رعایا کی بہبودی کے فروغ کے لیے ضروری تھی۔ مذہبی قانون کا حکم تھا اطاعت کرو اور سیاسی فکر اس کلیہ پر مبنی تھی کہ سلطان اطاعت کرانے کا اہل ہے۔ بیعت، خطبہ اور سکہ اقتدار اعلا کی علامتیں تھیں۔ خلیفہ کی طرف سے قبولیت کی سند بہت خوش آئند تھی لیکن لازمی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن نظری طور پر سلطان کی پوزیشن جتنی محکم معلوم ہوتی ہے حقیقت میں اتنی تھی نہیں۔ سمجھا جاتا تھا کہ سلطان کے بعد اس کا کوئی بیٹا ہی اس کا جانشین ہوگا لیکن حق وراثت کی وضاحت نہیں کی گئی اور کی بھی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اگر سلطنت کو سلطان کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا تو پھر اسے اس کے وارثوں میں تقسیم کرنا پڑتا۔ لیکن اگر یہ ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ ایسی چیز تھی جس کی پوری مسلم ملت حق دار تھی تو پھر الیکشن یا انتخاب کے ذریعے حکمران کو مقرر کرنے کا کوئی طریقہ ہونا چاہیے تھا۔ یعنی مذہبی قانون تسلسل برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اقتدار اعلا ازراہ قانون کا کوئی نظریہ قائم نہ کرسکا جس کا خوف ناک نتیجہ برآمد ہوا کہ وہ صرف اقتدار اعلا ازروئے حقیقت کا تصور ہی پیش کرسکا۔ اگر کسی سلطان کو کسی زیادہ طاقتور نے ہٹا دیا یا کسی نے کامیابی سے سازش کرکے اسے ہٹا دیا اور اس کے تخت پر قبضہ کرلیا تو وہ سلطان نہ رہا اور اپنی رعایا کی طرف سے اطاعت اور وفاداری کا اسے کوئی حق نہ رہا۔

مسلم سیاسی نظام کی یہ بنیادی خامی تھی۔ ساری مسلم دنیا میں ہونے والے واقعات اسے بار بار سامنے لا رہے تھے۔ اس نے نظم و نسق کے کارفرما جذبے اور طریق کار پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے زیادہ تر طور طریقوں کو متعین کیا۔ سلطان اگر اس تین حقیقت کو نظرانداز کردیتا کہ میرا اختیار مکمل طور پر

میری طاقت پر منحصر رہے تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتا اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کرے۔ (1) نظریاتی اعتبار اس طرح کہ سر اپنی بلندی پر اصرار کرے اور دیکھے کہ اس کی رعایا اس کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھے (2) مادی اعتبار سے اس طرح کہ خود اپنے مددگاروں کی ایک مضبوط پارٹی بنائے اور اپنے مخالفین کو تباہ کرے (3) نظم ونسق کے ذریعے اس طرح کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ اس کے حامیوں اور انتہائی وفاداروں میں بھی کوئی بہت زیادہ اثر اور طاقت حاصل نہ کرسکے اور (4) سیاسی طور پر اس طرح کہ ہر موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی رعایا کو مطمئن رکھے، انھیں مرعوب کرے اور خوف زدہ رکھے۔ سلطان میں کچھ ایسی خصوصیت ہو جو پر اصرار ہو اور اس کے متعلق قیاس آرائی مشکل ہو اس کے گرد لوگ اگر اس قابل ہوں کہ اس کے ردعمل کے متعلق صحیح قیاس لگا سکیں تو وہ سلطان کی کمزوری کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور یہ کمزوری مہلک ثابت ہوسکتی تھی کامیاب حکومت حکمراں کے اندازوں کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور یہ کمزوری مہلک ثابت ہوسکتی تھی کامیاب حکومت حکمراں کے اندازوں اور دوراندیشی کے ماہرانہ عمل درآمد کا نام تھا۔

کہا جاتا تھا کہ سلطان بلبن (1266-1286) نے کہا تھا ''اگر کوئی بادشاہ اپنے جد اور باپ کے ذریعے بادشاہ ہے اور حق وراثت کے ذریعے بادشاہت کا اہل ہے تو لازمی ہے کہ اس کی عظمت اور ہیبت (لوگوں کے) دلوں پر مرتسم ہو جائے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے احکام کی بجا آوری ہوگی۔ چاہے وہ یہ دکھانے کی بالکل کوشش نہ کرے کہ وہ سزا دے سکتا ہے یا سختی برت سکتا ہے یا خوف ودہشت پیدا کرسکتا ہے لیکن اگر وہ کسی بادشاہ کا بیٹا یا پوتا نہیں ہے تو وہ بادشاہوں کی عظمت اور اہلیت کا منبع نہیں ہوسکتا اور بادشاہت کے لیے جو جلال اور عظمت درکار ہے وہ اسے نہیں ملتیں نہ امیروں میں نہ عوام الناس میں، نہ خلوت میں نہ دربار میں۔ کسی بھی دل میں اس کے لیے اور اس کی سربلندی کے لیے کوئی جگہ نہیں مل پاتی ـــــ ہندو ناراض ہوجاتے ہیں اور مسلمان گنہگاری اور معصیت اور دوسری ممنوعہ چیزوں کی وجہ سے بدمتی ہوجاتے ہیں۔''

دہلی کے پہلے سلاطین سربرآوردہ 'غلام' تھے۔ ان کے بعد خلجی (1288-1320) اور تغلق (1320-1398) آئے۔ اس کے بعد بادشاہت کا سلسلہ سوری (1540-1556) اور مغل (1526-1540) اور (1556-1748) کے ہاتھ آیا۔ مغلوں میں ایسے بادشاہ تھے جو بادشاہوں کے بیٹے اور پوتے تھے اور صوبائی حکمراں خاندانوں میں بھی ایسے لوگ تھے۔ تخت کے لیے موروثی حق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ سوال ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہا کہ اگر حکمران کے ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو کون سا بیٹا جانشین ہوا۔ اخیر میں اس کا فیصلہ طاقت حاصل کرکے ہی ہوتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہت کا جاہ وجلال حاصل کرنا ہوتا تھا تاکہ اقتدار کا سلسلہ جاری رہے۔

بیعت ایک روایت تھی اور عام طور پر اس پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت جب اپنے کو حق دار کہنے والا حکمراں تخت پر بیٹھ جاتا تھا۔ صرف انھیں لوگوں سے بیعت کی ضرورت ہوتی تھی جن میں اجتماعی طور پر کسی کو سلطان بنانے یا برطرف کرنے کی طاقت ہوتی تھی یعنی اعلا عہدیدار اور فوجی سالار۔ عام رعایا کے درمیان خطبے میں اعلان اور نئے سکے کا اجرا کافی ہوتا تھا۔ خلیفہ کی طرف سے قبولیت ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن اگر مل جائے تو بہتر جب دہلی سلطنت قائم ہوئی تو اس وقت عباسی خلیفہ صرف برائے نام تھا اور جب 1258 میں منگولوں نے بغداد پر قبضہ کرکے اسے برباد کردیا تو خلافت ختم ہوگئی۔ دہلی کے سلاطین کے سکوں پر صرف امیر المومنین کندہ ہوتا تھا یعنی اس وقت تک جب تک محمد تغلق کے سفیروں نے مصر کے دربار میں خاندان بنو عباس کے ایک فرد کو دریافت نہیں کرلیا۔ 1517 میں ترکی کے سلطان سلیم نے قاہرہ فتح کیا اور عباسی خلافت کے اس ہوائی قلعہ کو بھی مسمار کردیا۔ سلطنت کے سکوں پر یا تو خلیفہ کا نام ہوتا تھا یا حکمراں سلطان کو خلیفہ کی طرف سے دیا ہوا خطاب ہوتا یا کوئی ایسا فقرہ جس سے خلیفہ کے ساتھ سلطان کا تعلق معلوم ہو۔ خلافت کے خاتمے کے بعد خلفائے راشدین کے نام جو محمد تغلق کے سکوں پر پہلے بھی موجود تھے کندہ کیے جانے لگے۔

سکے یہ ظاہر کرنے کا بھی ذریعہ تھے کہ سلطان کی پوزیشن کیا ہے۔ قطب الدین مبارک (1316-1320) نے سکے کے ایک طرف اپنے متعلق لکھوایا۔

''امام مقتدر، ولی اللہ، خلیفۂ مالک ومختار عرش وفرش، اس سلسلے میں محمد تغلق کا سکہ سب سے دلچسپ ہے۔ وہ اپنے متعلق لکھواتا ہے۔

''بندۂ خدا، اس کے عفو کا امیدوار، خاتم النبیین کی سنت کا موئد، وہ قرآن اور حدیث سے بھی نقل کرتا ہے'' جو سلطان کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔'' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے ان کی جو صاحب اقتدار ہیں۔'' اس کے علاوہ ایک جھوٹی حدیث بھی ہے۔ ''اگر سلطان نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو کھا جائیں۔'' غالباً وہ پہلا حکمراں ہے جس نے اپنے سکے پر لکھوایا کہ سلطان ظل اللہ (خدا کا سایہ) ہے۔ بعد میں یہ اصطلاح بہت عام ہوگئی۔ خدا کا سایہ ہونے کا دعویٰ اتنا غیر معمولی نہ لگا ہوگا کیوں کہ عام خیال یہ تھا کہ رسالت کے بعد اگر کوئی اعلا فریضہ ہے تو وہ ہے بادشاہت کا۔

□□□

کیریئر گائیڈنس

سلمان عابد

انگریزی میں مہارت — کورس اور ادارے

رابطہ انسانی سماج میں زندگی گزارنے کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ لسانی رابطہ ہو یا اشاراتی۔ موجودہ دور میں رابطے کی زبان کے طور پر انگریزی کو کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انگریزی زبان کی بنیاد پر ایک طالب علم اپنے لیے کیریئر کی اونچی منزلیں منتخب کرسکتا ہے۔ اس کے لیے انگریزی میڈیم کا طالب علم ہونا لازمی نہیں بلکہ کسی بھی میڈیم کے طالب علم کو اگر انگریزی زبان اور وہ بھی گفتگو کی زبان پر مہارت حاصل ہے تو پھر اس کو ملازمتوں یا روزگار کی کوئی کمی کبھی نہیں ہوگی۔

آج دنیا سمٹ گئی ہے چاہے وہ کمپیوٹر (laptop) کی شکل میں ہو یا موبائیل فون (انٹرنیٹ کے ساتھ) کی شکل میں۔ اس ترقی نے تعلیمی میدان پر بھی خاصا اثر ڈالا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے حصول علم اور ہر طرح کے نظریاتی اور عملی کورس کرنا بے حد آسان اور قابل رسا بنا دیا ہے اور اس کے لیے فاصلاتی طرز تعلیم رائج کیا گیا ہے۔

انگریزی زبان بطور رابطہ آج دنیا کے مختلف ممالک کی زبان ہے۔ خود وہ ممالک جہاں انگریزی کی بجائے دوسری زبان کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے وہاں بھی انگریزی نہ صرف رابطے کی بلکہ اہم انتظامی زبان ہے۔ انگریزی زبان اکیسویں صدی کے اہم کورسوں کے حصول کے لیے میڈیم کی واحد زبان ہے۔ پرکشش، اعلا روزگار کے حصول کے لیے بھی بات چیت کی زبان (Cummunicative English) کے طور پر بھی یہ لازمی ہوگئی ہے اور یہ بات سب سے زیادہ خوشی کی ہے کہ انگریزی زبان، نصابی زبان، رابطے کی زبان (Communicative) کا حصول اب بے حد آسان ہوگیا ہے۔ گھر بیٹھے بھی اس میں بڑی آسانی کے ساتھ مہارت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ہندستان کی مختلف جامعات اور جامعاتی رتبے کے مختلف اداروں نے ریگولر اور فاصلاتی طرز میں کورس شروع کردیے ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں۔

1. عثمانیہ یونیورسٹی، 2. جامعہ ہمدرد، 3. سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجیز (CIEFL)، 4. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد وغیرہ۔

دنیا کے کئی معتبر اور معیاری اداروں نے اس زبان کی عالمی و آفاقی اہمیت کے مدنظر بے حد معیاری کتابیں، کیسٹ اور اکتسابی مواد (Learning Material) تیار کیا ہے جو مارکیٹ میں دستیاب بھی ہے۔ ایسے اداروں اور ان کے ذریعے تیار کردہ اکتسابی مواد کی تفصیل درج ذیل ہے۔

آڈیو کیسٹ کا نام	تیار کنندہ ادارہ	طالب علم کی اہلیت	کیسٹ کے مشمولات
فن ٹائم	CIEFL	6 سے 12 سال	ایک کیسٹ اور دیگر مواد
کراڑی ٹیلس	انڈیا ٹوڈے (مارکیٹنگ)	6 سے 12 سال	ہر کہانی کے لیے ایک کیسٹ اور اس طرح 30 کیسٹ
اسپیک انگلش	اورنیٹ لانگ مین	پہلی سے آٹھویں جماعت	8 کتابیں، آٹھ کیسٹ
اسپوکن انگلش	CIEFL	10+2 کی سطح تک	3 کتابیں، 6 کیسٹ
میکرس اینڈ فائنڈرس	CIEFL	10+2 کی سطح تک	3 کتابیں، 6 کیسٹ
اسٹوری ٹائم	CIEFL	7ویں جماعت سے 10+2 سطح تک	2 کتابیں، 2 کیسٹ
لٹریچر یور انگلش	CIEFL اور آکسفورڈ یونیورسٹی	گریجویٹ اور اعلا تعلیم یافتہ	5 کتابیں، 2 کیسٹ
ٹائیگرس آئی	آکسفورڈ یونیورسٹی	گریجویٹ اور اعلا تعلیم یافتہ	1 کتاب۔ 3 کیسٹ

ان کتابوں اور آڈیو کیسٹ کے حصول کے لیے چند پتے درج ذیل ہیں۔

1. Central Institute of English and Foreign Languages, Osmania University Campus-Hyderabad. A.P. 500008. Telephone: +91-040-2709 8131/2709 1319. Website : www.ciefl.ac.in
2. BBC, British Institutes (Languages Division) UCO Bank Building-359-IIIrd Floor, Dr. D.N. Road, Flora Fountain, P.O. Box 1025,

Mumbai-400023
Telephone: +91-020-2870 755/ 6/57
E-mail: bief@bomz.vsnl.net.in
website:britinst.com

3. Orient Longman, 3-6-752, Himayatnagar, Hyderabad-500029,
Telephone: +91-040-2766 5446, 2761 0898,
Fax:+91-040, 2764 5046
website: www.orientlongman.com

ان کے علاوہ طالب علم اگر چاہیں تو ویڈیو کیسٹ اور سی ڈی بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے انگریزی میں مہارت پیدا کی جاسکتی ہے۔ چند معیاری نام یہ ہیں۔

ویڈیو کیسٹ کا نام	تیار کنندہ ادارہ	طالب علم کی اہلیت	کیسٹ کے مشمولات
فالوی I	B.B.C.	10+2 تک	4ویڈیو۔2 آڈیو۔2 کتابیں
فالوی II	B.B.C.	10+2 تک	4ویڈیو۔2 آڈیو۔2 کتابیں
آن دی گو	B.B.C.	ہر کسی کے لیے	3ویڈیو۔3 آڈیو۔ 3 کتابیں، ایک لیکچر بک

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ نے آج ہر دوری کو قریب اور قریب تر کر دیا ہے۔ گھر بیٹھے انٹرنیٹ پر بھی اس کورس کا مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایسے چند ویب سائٹوں کے پتے ہم یہاں طلبہ کی سہولت کی خاطر پیش کر رہے ہیں۔

www.edhelper.com
www.brainbashers.com
www.englishpage.com
www.period.com/puzzles
www.englishclub.com
www.fluentzy.com
www.online.edu/est/teacher
www.education.nic.in
www.britishcouncil.org/india
www.oup.com/elt/oald
www.puzzles.com
www.wordcentral.com
www.thinks.com
www.englishskills.com
www.vocabulary.com
www.hindu.com/edu/2004/01/19/stories/2004011900220400 html.

□□□

سائنس کی کہانیاں (حصہ اول)

مصنف: سکلف اور سکلف/مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا
تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے
مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق
تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18/ روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست
اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد و توہمات سے
واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، علمی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔
اس لیے یہ عوام سے قریب ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں
جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

ترکی کہانیاں

مصنف: محمد علی بھوری/انتخاب: شمیم احمد

محمد علی بھوری کی کتاب "قورتوق" ترکی ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ [illegible] پر مشتمل
اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں
بچوں کی ذہنی صلاحیت کو [illegible] کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے
تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہو سکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں
ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی
پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت: -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

امیت جین، سمراٹ شرما، سوربھ بنرجی "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس

پریزنٹیشن کی تیاری

۔۔شہنشاہوں کے گھوڑے اور شہنشاہوں کے ملازمین باہم دیگر بے ہنگم و بے ترتیب نہیں رکھے جاسکتے، گوکہ ٹولس اور بٹنوں کے بارے میں آپ کو بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے تاہم ہم نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ پریزنٹیشن کیسے تیار کیے جاتے ہیں، بلکہ میرے دوست اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ آؤ ہم پریزنٹیشن کی تخلیق کریں۔ بس ابھی فوراً!

پہلی پریزنٹیشن کی تخلیق

کیا آپ کو وہ ڈائیلاگ باکس یاد ہے، جسے ہم نے پاور پوائنٹ کھولتے وقت دکھایا تھا؟ آؤ دیکھیں کس طرح مختلف آپشنوں کا استعمال کرکے آپ ایک پریزنٹیشن کرسکتے ہیں۔

دی ویزارڈ آف اوز

نئے سیکھنے والوں (جیسے آپ) کے لیے آٹو کنٹینٹ ویزارڈ (Auto Content Wizard) بہترین آپشن ہے۔ کیونکہ یہ نہایت آسانی کے ساتھ پریزنٹیشن کی شروعات کے لیے آپ کو آمادہ کرتا ہے اور آپ منی مل فس (Minimal fuss) کے ساتھ شروعات کرسکتے ہیں۔ اگر آپ آٹو کنٹینٹ ویزارڈ سلیکٹ کرتے ہیں تو آپ کو ایک کھلتا ہوا ڈائلاگ باکس نظر آئے گا جیسا کہ دکھایا گیا ہے۔

بائیں طرف وہ طریقہ کار دیا گیا ہے جن کے تحت آپ کو اس ویزارڈ میں گزرنا ہے۔ Next آپشن پر کلک کرکے آگے کی طرف اور wellیا back آپشن پر کلک کرکے پیچھے کی طرف جاسکتے ہیں۔

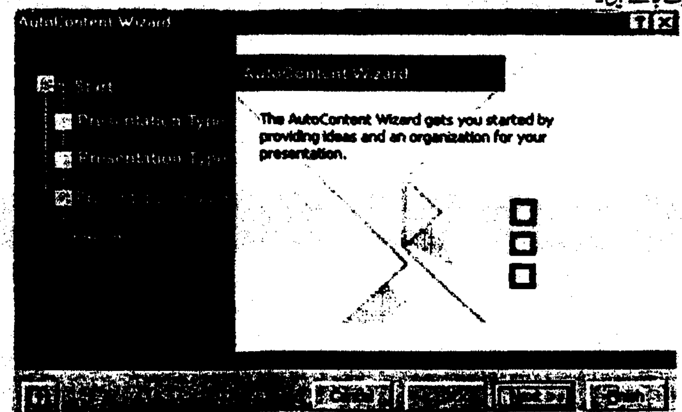

تصویر نمبر-1، آٹو کنٹینٹ ویزارڈ ڈائیلاگ باکس

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ ایس۔ آئی۔ آر یونٹ نے طلبہ اور علم شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو انہیں کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

٭ دوسرا اسکرین پریزنٹیشن ٹائپ کو سلیکٹ کرنے میں آپ کی مدد کرے گا۔

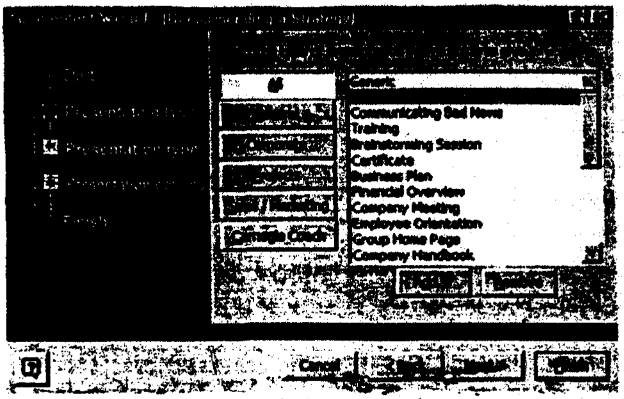

تصویر نمبر-2، آٹو کنٹینٹ ویزارڈ ڈائیلاگ باکس

تمام انواع (Types) کو غور سے دیکھیں اور جو موزوں ترین ہو اس کا انتخاب کریں۔ اگر آپ کسی مناسب چیز کا انتخاب نہیں کر سکتے مثلاً پریزنٹیشن آن ڈبلیو ڈبلیو ایف (presentation on WWF) تو جینیرک (Generic) کو سلیکٹ کریں اور next پر کلک کریں۔ تیسرے اسکرین پر آپ کو پریزنٹیشن کی نوعیت کا انتخاب کرنا ہوگا۔

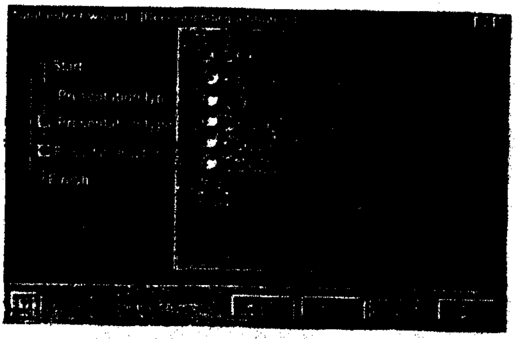

تصویر نمبر-3، آٹو کنٹینٹ ویزارڈ ڈائیلاگ باکس

اسکرین پر پریزنٹیشن بہت ہی عام اور جاری ضروریات کے لیے بہت ہی موزوں ہوتا ہے۔ شیکسپیئر کا کہنا ہے کہ ''نام میں کیا رکھا ہے؟'' بہت کچھ۔ اگر مجھ سے پوچھو۔

Next آپشن پر کلک کریں تو دوسرا اسکرین آپ کی پریزنٹیشن کا نام پوچھے گا۔ فوٹر انٹری Footer entry کے اندر آپ اپنے کام کا اندراج کرسکتے ہیں۔
Next بٹن پر کلک کرنے کے بعد آپ کو جو اسکرین دکھائی دے رہا ہے یہ آخری اور فائنل اسکرین ہے۔ پیچھے جانے کے لیے Back پر کلک کریں اور پیچھے جاکر جو تبدیلی آپ چاہیں کرسکتے ہیں۔

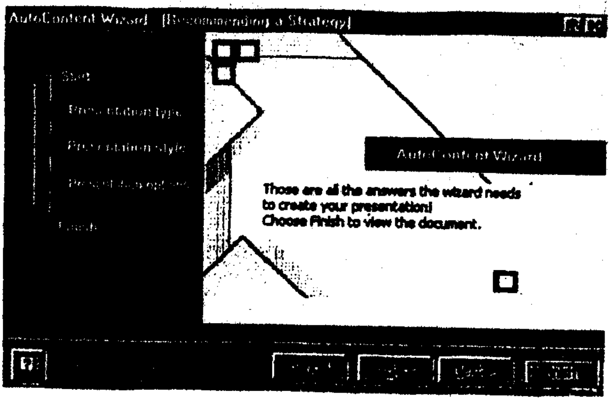

تصویر نمبر-4، آٹوکنٹینٹ ویزارڈ ڈائیلاگ باکس

آپ اپنا سارا کام ختم کرکے لنچ کے لیے بھی جاسکتے ہیں۔ اگر آپ نے اس میں ڈوبے رہنے کا فیصلہ کرہی لیا ہے تو آپ کو صرف Finish بٹن پر کلک کرنے کی ضرورت ہے اور آپ کا پریزنٹیشن آپ کے سامنے ہوگا۔

ٹمپلیٹس کا استعمال

ٹمپلیٹ ایک محفوظ (save) کی ہوئی فائل ہے جو پہلے سے متعین سلائڈ اور ٹائٹل اسٹائلس پر مشتمل ہوتی ہے۔ آپ کو ایک ڈائیلاگ باکس دکھائی دے گا جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔
اپنی پسند کے مطابق مناسب ترین ٹیب یا ڈیزائن کو سلیکٹ کریں اور OK بٹن پر آپ کا پریزنٹیشن ٹمپلیٹ ڈیزائن کی طرح دکھائی دے گا۔

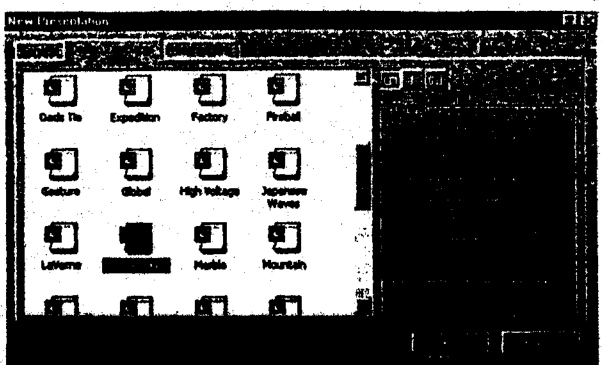

تصویر نمبر-5، آٹوکنٹینٹ ویزارڈ ڈائیلاگ باکس

اگر آپ جنرل ٹیب یا پریزنٹیشن ڈیزائن ٹمپلیٹ سے ایک بلینک (خالی) پریزنٹیشن کو سلیکٹ کرتے ہیں تو ایک نیا سلائڈ ڈائیلاگ باکس دکھائی دے گا جو لے آوٹ (Layout) آپ چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کریں اور OK بٹن پر کلک کریں۔

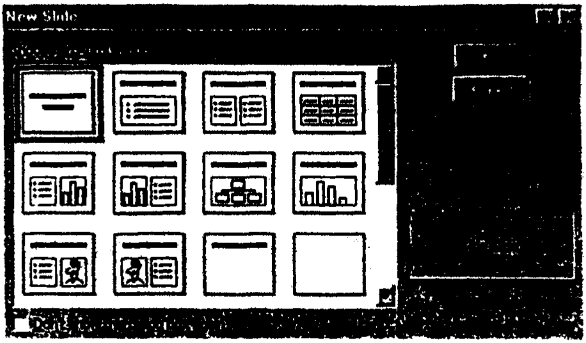

تصویر نمبر-6، نیو پریزنٹیشن ڈائیلاگ باکس

اپنے پریزنٹیشن کو محفوظ (Save) کرنا اور کھولنا

پاور پوائنٹ ڈائیلاگ باکس میں موجود پریزنٹیشن آپشن پر Open بٹن کو سلیکٹ کرکے آپ ایک پریزنٹیشن کو کھول سکتے ہیں۔ آپ فائل مینو کے Open آپشن کو سلیکٹ کرکے بھی کسی پریزنٹیشن کو کھول سکتے ہیں۔

اب جبکہ آپ نے ایک پریزنٹیشن تیار کرلیا ہے تو آؤ دیکھیں کہ آپ کسے کیسے محفوظ (Save) کرسکتے ہیں۔ ان سب کے بعد اگر آپ کا کام بہت ہی اچھا ہے اور آپ اسے دوسروں کو دکھانا نہیں چاہتے تو فائل مینو کے SaveAs آپشن پر کلک کریں۔ ایک ڈائیلاگ باکس نمودار ہوگا جیسا کہ نیچے دکھایا گیا ہے۔

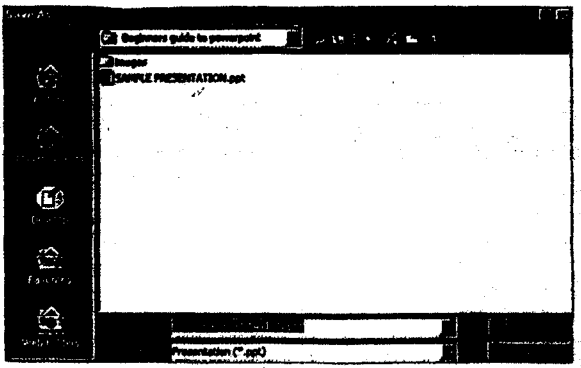

تصویر نمبر-7، نیو سلائڈ ڈائیلاگ باکس

فائل کا ایک مخصوص نام لکھو مثلاً Presentation 1 اور Save بٹن پر کلک کریں۔

سلائڈس کو انسرٹ (Insert) یا ڈیلیٹ (Delete) کرنا

سائنس پروجیکٹ سے متعلق آپ کے پریزنٹیشن میں بہت ساری معلومات شامل ہوسکتی ہیں اتنی زیادہ کہ ایک سلائڈ میں نہ آسکیں۔ ایک سے زائد سلائڈ انسرٹ کرنے کے لیے آپ کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ:

انسرٹ مینو میں نیو سلائڈ آپشن پر کلک کریں۔ پہلے کی طرح یہ ایک آٹو لے آؤٹ ڈائیلاگ باکس کھولے گا۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق آٹو لے آؤٹ سلیکٹ کریں اور OK پر کلک کریں۔ سلائڈ کو ختم کرنے کے لیے normal view میں جائیں اور اس سلائڈ کو سلیکٹ کریں جسے آپ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

اب ایک مشکل کام Del key کو پریس کریں۔

Hmmm۔۔۔۔ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کو ابھی سائنس پروجیکٹ پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور آپ نہیں جانتے کہ اپنے ٹیکسٹ کو کیسے ایڈٹ کریں گے۔

□□□

دھوپ چولھا

مصنف: ایم۔ایم۔ہدی/مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے
کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں
ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
''کیمیا کی کہانی'' میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم
اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

سائنس کی کہانیاں (حصہ اول)

مصنف: بسکٹ اور سکٹ/مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جز ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا
تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے
مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق
تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست
اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد و توہمات سے
واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع اور فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔
اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں
جو عربی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مہجور/انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مہجور کی کتاب ''نورتن'' قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل
اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں
بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے
تاکہ بچے انہیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک تاتی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں
ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی
پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

معراج احمد

کوئز

ہندستان کا آئین

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 10 تاریخ تک موصول ہوجانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) ہندستان کا آئین کس طرح کا ہے؟

(الف) یہ وفاقی ہے (ب) یہ یونین ہے

(ج) یہ نہ وفاقی ہے نہ یونین ہے (د) یہ صدارتی طرز حکومت دیتا ہے

(2) ہندستان کا آئین تیار کرنے میں کتنا وقت لگا تھا؟

(الف) 2 سال 7 مہینہ اور 23 دن (ب) 2 سال 11 مہینے اور 18 دن

(ج) 3 سال اور 14 دن (د) ان میں سے کوئی نہیں

(3) آئین ہند کی تمہید میں ہندستان کو بتایا گیا ہے؟

(الف) خودمختار جمہوریہ (ب) خودمختار جمہوری ملک

(ج) خودمختار، سوشل، سیکولر (د) سوشلسٹ جمہوریہ

(4) ہمارے آئین میں ریاست کے ہدایتی رہنما اصولوں کی ترغیب کس ملک کے آئین سے ملی ہے؟

(الف) جنوبی افریقہ (ب) فرانس

(ج) آئرلینڈ (د) جاپان

(5) برطانوی حکومت نے آئین ساز اسمبلی کے مطالبے کو کس بنیاد پر قبول کیا تھا؟

(الف) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935

(ب) 1940 کی تجاویز

(ج) کیبنٹ مشن، 1946

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(6) ذیل میں سے کسے ہندستانی آئین کا بانی مانا جاتا ہے؟

(الف) ڈاکٹر راجندر پرساد (ب) پنڈت جواہر لال نہرو

(ج) ڈاکٹر بی آر امبیڈکر (د) سردار ولبھ بھائی پٹیل

(7) 1922 میں کس شخص نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندستانی عوام خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں؟

(الف) مہاتما گاندھی (ب) موتی لال نہرو

(ج) گوپال کرشن گوکھلے (د) چترنجن داس

(8) آئین کے مطابق ہندستان کا اوّلین شہری کون ہے؟

(الف) وزیر اعظم (ب) صدر

(ج) چیف جسٹس (د) لوک سبھا کا اسپیکر

(9) مجلس آئین ساز کے لیے انتخاب کب ہوا؟

(الف) جون 1946 (ب) جولائی 1946

(ج) ستمبر 1946 (د) دسمبر 1946

(10) ملک آزاد ہونے کے بعد مجلس آئین ساز کی پہلی میٹنگ کب ہوئی؟

(الف) 31 راگست 1947 (ب) 12 ستمبر 1947

(ج) 24 ستمبر 1947 (د) 31 اکتوبر 1947

(11) بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے کورٹ کتنے طرح کے رٹ (Writ) جاری کرسکتا ہے؟

(الف) چار طرح کے (ب) تین طرح کے

(ج) چھ طرح کے (د) پانچ طرح کے

(12) پہلی دفعہ صدر جمہوریہ ہند نے ایمرجنسی کا اعلان کب کیا تھا؟

(الف) 26 رجنوری 1950 (ب) 26 راکتوبر 1962

(ج) 4 راکتوبر 1965 (د) 4 رنومبر 1965

(13) ذیل میں سے کس کو "بابائے لوک سبھا" کے طور پر جانا جاتا ہے؟

(الف) ایم۔اے۔ آئنگر (ب) جواہر لال نہرو

(ج) سردار ولبھ بھائی پٹیل (د) جی.وی. ماؤلنکر

(14) مندرجۂ ذیل میں سے کون سا قول صحیح ہے؟

(الف) ہندستان کا صدر چیف جسٹس کی صلاح پر لوک سبھا تحلیل کرسکتا ہے۔

(ب) مالی بل راجیہ سبھا میں پہلے پیش نہیں کیا جاسکتا۔

(ج) صدر پارلیمنٹ کا ممبر ہوتا ہے۔

(د) راجیہ سبھا کے ایک تہائی ممبر ہر سال سبکدوش ہوجاتے ہیں۔

(15) مرکزی کابینہ کس کے تئیں جواب دہ ہوتی ہے؟

(الف) صدر (ب) پارلیمنٹ

(ج) لوک سبھا (د) راجیہ سبھا

(16) ریاست کی پالیسیوں سے متعلق رہنما اصول کے مطابق، کتنے سال تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جاتی ہے؟

(الف) 18 سال (ب) 10 سال

(ج) 14 سال (د) 16 سال

(17) راجیہ سبھا کی تشکیل سب سے پہلے کب ہوئی؟

(الف) 28 جنوری 1952 (ب) 11 فروری 1952

(ج) 19 مارچ 1952 (د) 3 اپریل 1952

(18) اگر صدر کا انتقال ہوجاتا ہے یا وہ استعفیٰ دے دیتا ہے یا اُسے عہدے سے ہٹادیا جاتا ہے (اور اگر نائب صدر بھی موجود نہیں ہے) تو صدر کے عہدے کی ذمے داری کون سنبھالتا ہے؟

(الف) سپریم کورٹ کا چیف جسٹس

(ب) لوک سبھا کا اسپیکر

(ج) راجیہ سبھا کا نائب چیئرمین

(د) نئے صدر کے انتخاب تک یہ عہدہ خالی رہتا ہے۔

(19) ہندستانی افواج کا اعلا افسر کون ہوتا ہے؟

(الف) صدر (ب) وزیر اعظم

(ج) جنرل (د) فیلڈ مارشل

(20) ہندستان کے صدر کا انتخاب ایک الکٹورل کالج کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس الکٹورل کالج میں شامل ہوتے ہیں:

(الف) لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے منتخب ارکان

(ب) لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے بھی ممبران

(ج) پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اور ریاستی اسمبلیوں کے منتخب ارکان

(د) پارلیمنٹ کے بھی ارکان اور بھی دستور ساز اسمبلیوں اور مجلسِ دستور ساز کے ممبران

(21) حزبِ مخالف کے طور پر تسلیم کیے جانے کے لیے کسی سیاسی پارٹی کو کم از کم کتنی فی صد سیٹیں ملنی چاہئیں؟

(الف) 5 فی صد (ب) 10 فی صد

(ج) 15 فی صد (د) 20 فی صد

(22) مندرجۂ ذیل میں سے کن ریاستوں میں پنچایتی راج شروع کیا گیا؟

(الف) گجرات اور مہاراشٹر میں (ب) مہاراشٹر اور راجستھان میں

(ج) تمل ناڈو اور راجستھان میں (د) گجرات اور راجستھان میں

(23) حکومت کے اخراجات پر قابو رکھنے کا مکمل اختیار کس کو ہے؟

(الف) پارلیمنٹ کو (ب) وزیر اعظم کو

(ج) صدر کو (د) لوک سبھا کو

(24) ہندستان کے آزادی ایکٹ کو کس دن برطانوی سامراج کی منظوری ملی؟

(الف) 1 جولائی 1947 (ب) 18 جولائی 1947

(ج) 15 جولائی 1947 (د) 21 جولائی 1947

(25) ہندستان میں کس طرح کی حکومت کا نظام اپنایا گیا ہے؟

(الف) امریکی (ب) برطانیہ کا پارلیمنٹری نظام

(ج) فرانسیسی (د) مجموعی وزارتی نظام

(26) پارلیمنٹ کے ذریعے پاس ہونے پر کسی ریاست میں صدر راج ایک دفعہ میں کتنے عرصے کے لیے ہوتا ہے؟

(الف) چھ ماہ کے لیے (ب) چھ سال کے لیے

(ج) بارہ ماہ کے لیے (د) دو ماہ کے لیے

(27) راجیہ سبھا کس نوعیت کا ادارہ ہے؟

(الف) ایک مستقل ادارہ (ب) ایک عارضی ادارہ

(ج) بغیر چیئرمین کا ایوان (د) ایک چیئرمین والا ایوان

(28) راجیہ سبھا کسی مالی بل کو زیادہ سے زیادہ کتنے دن تک زیر غور رکھ سکتا ہے؟

(الف) 30 دن تک (ب) 14 دن تک

(ج) 15 دن تک (د) 2 ماہ تک

(29) مرکز کے زیر انتظام علاقے (Union Territory) میں حکومتی کام کون کرتا ہے؟

(الف) صدر کے ذریعے مقرر کردہ انتظامی افسر

(ب) ہندستان کا وزیر اعظم

(ج) نائب صدر کے ذریعے مقرر کیا ہوا انتظامی افسر

(د) حکومتِ ہند کا وزیر قانون

(30) لوک سبھا میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر کون سا عہدہ سنبھالتا ہے؟

(الف) وزیر اعظم کا (ب) صدر جمہوریہ کا

(ج) نائب صدر جمہوریہ کا (د) لوک سبھا اسپیکر کا

(31) لوک سبھا کے پہلے منظوری حاصل کیے ہوئے حزب مخالف لیڈر کون تھے؟

(الف) وائی. بی. چوہان (ب) مرارجی دیسائی

(ج) جگجیون رام (د) اٹل بہاری واجپئی

(32) 73ویں آئینی ترمیم کے بعد پنچایتی راج ایکٹ کا نفاذ سب سے پہلے کس ریاست میں ہوا؟

(الف) راجستھان (ب) مہاراشٹر

(ج) کرناٹک (د) آندھرا پردیش

(33) زندگی اور جسمانی آزادی کا حق کس دفعہ میں ہے؟

(الف) 22 میں (ب) 24 میں

(ج) 21 میں (د) 26 میں

(34) مالی بل کا تذکرہ آئین کے کس دفعہ میں ہے؟

(الف) 112 میں (ب) 110 میں

(ج) 108 میں (د) 106 میں

(35) ریاستوں کی دوبارہ تشکیل تو کس آئینی ترمیم کے تحت ہوئی؟

(الف) پانچویں (1954) (ب) بارھویں (1962)

(ج) ساتویں (1956) (د) ان میں سے کوئی نہیں

(36) پانڈیچیری کو کس آئینی ترمیم کے تحت ہندستان کا حصہ بنایا گیا؟

(الف) بارھویں (1962) (ب) چودھویں (1962)

(ج) چھبیسویں (1971) (د) ان میں سے کوئی نہیں

(37) سکم کو ریاست کا درجہ کس آئینی ترمیم کے تحت دیا گیا؟

(الف) بارھویں (1962) (ب) چودھویں (1962)

(ج) ستائیسویں (1971) (د) چھتیسویں (1975)

(38) ووٹ دینے کے حق کی عمر 21 سال سے گھٹا کر 18 سال کب اور کس آئینی ترمیم کے ذریعے کی گئی؟

(الف) 61ویں (1988) (ب) 52ویں (1985)

(ج) 65ویں (1990) (د) 71ویں (1991)

(39) کس آئینی ترمیم کے ذریعے دہلی کا نام قومی دارالحکومت علاقہ کیا گیا اور وودھان سبھا کی تعمیر کی گئی؟

(الف) 61ویں (1988) (ب) 69ویں (1991)

(ج) 73ویں (1992) (د) 74ویں (1992)

(40) 84ویں آئینی ترمیم کس سے متعلق ہے؟

(الف) چھتیس گڑھ، اترانچل اور جھارکھنڈ ریاستوں سے متعلق

(ب) سرکاری نوکریوں میں ریزرویشن سے متعلق

(ج) راجاؤں کے خصوصی اختیارات کو ختم کرنے کے متعلق

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(41) کس مقدمے کے ذریعے سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ دفعہ 368 کے ذریعے بنیادی حقوق میں ترمیم کی جا سکتی ہے؟

(الف) شنکری پرساد بنام ہندستانی یونین (1952)

(ب) گولک ناتھ بنام پنجاب ریاست (1967)

(ج) کیشوانند بھارتی بنام کیرل ریاست (1973)

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(42) 73ویں آئینی ترمیم کا نفاذ کب ہوا؟

(الف) 22 اپریل (1993) (ب) 24 اپریل (1993)

(ج) 20اپریل(1993) (د) 25اپریل1993

(43) ہندو شادی ایکٹ کب پاس ہوا؟

(الف) 1952 (ب) 1954

(ج) 1956 (د) 1955

(44) ریاستوں کو اور زیادہ خود مختاری عطا کرنے کی سفارش کس کمیٹی نے کی تھی؟

(الف) سردار سورن سنگھ کمیٹی(1966) (ب) سیتل وار کمیٹی(1966)

(ج) راجہ منا کمیٹی(1969) (د) ان میں سے کوئی نہیں

(45) کس کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ریاستوں کی تشکیل صرف زبان کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیے؟

(الف) دھر کمیشن(1947-48) (ب) کوٹھاری کمیشن(1976)

(ج) سرکاریا کمیشن(1983) (د) ان میں سے کوئی نہیں

(46) کس کمیٹی کے ذریعے الیکشن میں اصلاح کی سفارش کی گئی؟

(الف) سیتل وار کمیٹی (ب) راجہ منا کمیٹی

(ج) وی.ایم.تارکنڈے کمیٹی (د) بلونت رائے کمیٹی

(47) ایوان کا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی ایوان کی کارروائی میں کون حصہ لے سکتا ہے؟

(الف) ہندستان کا صدر (ب) سپریم کورٹ کا چیف جسٹس

(ج) ہندستان کا اٹارنی جنرل (د) ہندستان کا ایڈمنسٹریٹر جنرل

(48) پہلے مالی کمیشن کی تشکیل کب ہوئی؟

(الف) 1952 (ب) 1950

(ج) 1953 (د) 1951

(49) بندھوا مزدور انسداد ایکٹ کب پاس ہوا؟

(الف) 1970 (ب) 1972

(ج) 1975 (د) 1977

(50) جس آدمی کا نام وزیر اعظم نے تجویز کیا ہو، کیا صدر اس کو وزیر منتخب کر سکتا ہے؟

(الف) نہیں (ب) ہاں

(ج) صدر کو ایسا کرنے کا حق ہے (د) ان میں سے کوئی نہیں

□□□

ہمیں اپریل کے کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

جانچ کے بعد درج ذیل حضرات کو بالترتیب اول، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. جاوید احمد
256، تاپتی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-67

2. سید محمد ندیم
8/2، کنارا اپارٹمنٹ، وی. آئی. پی. روڈ،
بھوپال-462001، مدھیہ پردیش

3. اعجاز احمد قریشی
محلہ: آستانہ، پوسٹ: کرنجا، ضلع واشم،
مہاراشٹر-444105

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

پچھلے انعامی مقابلے ("سائنس کوئز") کے صحیح جوابات یہ ہیں:

1. ب	2. الف	3. د	4. الف	5. ب
6. ج	7. ب	8. الف	9. ب	10. د
11. ج	12. د	13. الف	14. ب	15. ج
16. الف	17. د	18. الف	19. ب	20. ب
21. د	22. الف	23. الف	24. الف	25. ب
26. ج	27. د	28. د	29. ب	30. ج
31. الف	32. د	33. ب	34. د	35. الف

طارق عمیر عثمانی

بڑھتے قدم

محمد آصف کا تعلق مالیرکوٹلہ (پنجاب) کے ایک پس ماندہ خاندان سے ہے اور اس وقت مالیرکوٹلہ (پنجاب) کے ایک سرکاری اسکول میں بی.اے. سال اوّل کے طالب علم ہیں۔ اسی دوران محمد آصف نے دارالسلام اسلامی مرکز مالیرکوٹلہ سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے چلائے جارہے اردو ڈپلوما کورس کو بھی مکمل کیا ہے اور اسی بنا پر آج برسرِروزگار ہیں۔ ان سے کی گئی بات چیت قارئین "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: والد کے انتقال کے بعد ہمارے گھر کے معاشی حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ اسی دوران مجھے کمپیوٹر کورس کرنے کا شوق ہوا تا کہ کوئی ملازمت مل سکے لیکن اس کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ قومی کونسل کے کمپیوٹر سینٹر نے میرا یہ شوق پورا کردیا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: اس کا نصاب بہت اچھا ہے، سرٹیفکیٹ منظور شدہ ہے اور اس کی فیس بھی مناسب ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے۔ اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں ان سینٹروں میں دی جارہی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ تربیت کا طریقہ بہت عمدہ ہے۔ یہاں پر سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: کمپیوٹر آج کے دور کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ کمپیوٹر کے بغیر اب ہر دفتر نامکمل ہے۔ اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کونسل کے یہ سینٹر ایک اہم رول ادا کررہے ہیں۔ میں بہت ضرورت مند تھا، اس کورس کی بنا پر ہی مجھے ملازمت ملی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: خوشی کا احساس ہورہا ہے کیونکہ اس کی بدولت میں زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: یقیناً میرے اندر تبدیلی آئی ہے اور میری خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بھی اس تیز رفتار دنیا کا ایک حصہ ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: اس سینٹر میں مجھے نہ صرف اردو سیکھنے کا موقع ملا بلکہ یہاں میری ہندی زبان بھی درست ہوگئی اور اب میں کئی زبانیں جانتا ہوں۔ اس بنا پر مارکیٹ میں مجھے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ نہیں تھی؟

جواب: یہاں پر میرے ساتھ فیس میں بھی مزید رعایت برتی گئی جس کے باعث فیس کی ادائگی میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، ہاں اگر یہ رعایت نہ دی گئی ہوتی تو مجھ جیسے غریب طالب علم کے لیے یہ کورس کرنا مشکل تھا۔

□□□

Darus Salam Islamic Centre, Delhi Gate,
Malerkotla, Punjab-143023

اردو خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی سالانہ میٹنگ

● نئی دہلی، 31 / مارچ۔ "اردو ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب کی علم بردار زبان ہے اور ملک میں اتحاد، سیکولرزم اور سماجی اقدار کے فروغ میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ زبان امن و آشتی اور ایثار و قربانی کے جذبے کو بڑھاوا دینے میں ہمیشہ آگے رہی ہے۔ اردو کی انھی خوبیوں کی وجہ سے وہ لوگ بھی اس پر فریفتہ ہیں جو اردو نہیں جانتے۔ وزارت ترقی انسانی وسائل اس اہم ہندستانی زبان کے فروغ کے لیے پابند عہد ہے اور اس وزارت کے ماتحت قومی اردو کونسل اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ مشترکہ تہذیب کو استحکام بخشنے میں کلیدی رول ادا کر رہی ہے۔" ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے قومی اردو کونسل کے نویں عام اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارا کام ایسے مواقع مہیا کرنا ہے کہ ایک عام آدمی ایک قابل انسان کے روپ میں ملک کی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکے۔ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر تبھی آگے بڑھ سکے گا جب ملک کے ہر شہری کو ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔

اردو داں طبقے کے نوجوانوں کو روزگار مرکوز تربیت دینے کے لیے قومی اردو کونسل کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کونسل نے اردو بولنے والوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اہم قدم اٹھائے ہیں۔ کونسل نے اردو سے وابستہ افراد کو آگے لانے کے لیے پورے ملک میں 22 ریاستوں کے 117 ضلعوں میں 224 کمپیوٹر سینٹر قائم کیے ہیں جن میں 13820 طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں نور و اسکیم کے تحت کھولے گئے 50 سینٹر بھی شامل ہیں جو صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اب تک 22905 طلبہ (جن میں 10435 خواتین ہیں) کو کمپیوٹر ڈپلوما دیا جا چکا ہے اور ان میں ایک بڑی تعداد کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ملازمت حاصل ہوئی ہے۔ کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے اردو ڈپلوما کورس کی تعریف کرتے ہوئے جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ اس کورس کے ذریعے اردو زبان اور رسم الخط سیکھنے کے خواہش مند حضرات کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی ہے۔

مرکزی وزیر نے بچوں کے لیے ایک بہتر اور کارآمد نصاب تیار کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انھوں نے فروغ اردو کے لیے کونسل کی جانب سے چلائے جا رہے مختلف پروگراموں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے یہ یقین دہانی کرائی کہ کونسل کو وزارت کی طرف سے مکمل تعاون دیا جائے گا اور اردو زبان و ادب اور تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے مزید اقدام اٹھائے جائیں گے۔

قبل ازیں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے استقبالیہ خطبے میں ادارے کا تعارف پیش کرتے ہوئے اردو زبان و تعلیم کے فروغ کے لیے کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے پروگراموں کا مختصر خاکہ پیش کیا۔

کونسل کے سالانہ جلسے سے پہلے ایگزیکیٹیو بورڈ کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی نے کہا کہ اردو تیزی سے بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ اس کا دائرہ اب ہندستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ خلیجی ممالک، یورپ اور امریکہ میں بھی یہ زبان بولی اور پڑھی جا رہی ہے۔ اس لیے کونسل ان ممالک میں اردو کو مزید فروغ دینے اور اسے مقبول بنانے کے لیے اردو کتاب میلوں کے انعقاد کے امکانات پر غور کر رہی ہے۔

جناب فاروقی نے بتایا کہ ملک کے مختلف حصوں (اردو کے روایتی علاقوں) میں کونسل کے ریجنل سینٹر کھولے جائیں گے اور ان میں اردو سے وابستہ دانشور اور اسکالر شامل کیے جائیں گے تاکہ ان علاقوں میں اردو زبان اور تعلیم کی ترقی کی رفتار میں تیزی لائی جا سکے۔ فاروقی صاحب نے اگلے مالی سال کے اشاعتی پروگرام سے بھی شرکا کو واقف کرایا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کونسل فی الحال 47 اردو اخبارات کو یو این آئی سروس کی فراہمی کے لیے 50 فیصد سبسڈی دے رہی ہے۔ اس اسکیم میں مزید اخبارات کو شامل کیا جائے گا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر رفیق زکریا کمیٹی کی رپورٹ پر بھی بحث ہوئی جس میں ملک کے اردو میڈیم اسکولوں کے معیار میں بہتری لانے، مادری زبان میں بنیادی تعلیم فراہم کرنے، اردو کو مناسب مقام دلانے اور قومی اردو کونسل کو مزید اختیارات دینے کی سفارش کی گئی ہے۔

اس موقعے پر کتابوں کی تھوک خریداری اسکیم کے تحت لی گئی کتابوں کو ملک کے مختلف حصے میں موجود کتب خانوں تک پہنچانے کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ کونسل کتاب کی خریداری سے متعلق مصنف کو اپنی رضامندی سے مطلع کرکے کتب خانوں کے نام اور پتے ارسال کر دے گی اور مصنف حضرات براہ راست اپنی کتابیں کتب خانوں کو بھیج دیں گے۔ اس سے جلد از جلد کتابیں مطلوبہ کتب خانوں تک پہنچ سکیں گی۔

میٹنگ میں پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر اُدے نارائن سنگھ (ڈائرکٹر سی آئی آئی

ایل)، پروفیسر نسیم بھالیہ، جناب ندا فاضلی، جناب سعید نقوی، پروفیسر صادق، جناب زبیر رضوی، جناب پی.اے. انعامدار، ڈاکٹر علی جاوید، جناب گوہر رضا، جناب اقبال مجید اور جناب اسد زیدی نے بطور ممبر شرکت کی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے اس میٹنگ میں خاص طور سے شرکت کی۔ وزارت ترقی انسانی وسائل کی نمائندگی محترمہ بیلا بنرجی (جوائنٹ سکریٹری، لینگویجز)، ڈی سدھا کرن (ڈپٹی سکریٹری فنانس) اور جناب اے. کے. قاسم (اسسٹنٹ فنانشل ایڈوائزر) نے کی۔

قومی اردو کونسل کا بجٹ 11 کروڑ روپے مقرر

● نئی دہلی، 7 اپریل۔ حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کے آئندہ مالی سال 06-2005 کا بجٹ 11 کروڑ روپیہ مقرر کیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ کونسل کے ایگزیکیٹیو بورڈ نے ادارے کی فنانس کمیٹی کی تشکیل بھی کر دی ہے۔ کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی فنانس کمیٹی کے چیئرمین مقرر کیے گئے ہیں۔ کونسل جو اردو زبان و تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے ایک قومی نوڈل ایجنسی کے طور پر سرگرم عمل ہے، آئندہ مالی سال میں اردو میں مختلف موضوعات پر اہم کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی سینٹر اور اردو اسٹڈی سینٹر قائم کرنے پر مزید توجہ دے گی۔ کونسل کی کوشش ہے کہ نہ صرف اردو میں معیاری علمی کتابیں شائع ہوں بلکہ عصری تقاضوں سے بھی اردو طلبہ کو ہم آہنگ کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں میں 224 کمپیوٹر سینٹروں کے قیام کے ذریعے اس کوشش کو عملی شکل دی گئی ہے۔ اردو رسم الخط سکھانے پر بھی کونسل نے خصوصی توجہ دی ہے اور اس کے 103 اسٹڈی سینٹروں میں تقریباً 20 ہزار افراد نے داخلہ لیا ہے جن میں ہر عمر، مذہب اور علاقے کے لوگ شامل ہیں۔

کونسل کی فنانس کمیٹی کے چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کے ممبران مندرجۂ ذیل ہیں:۔ پروفیسر نسیم بھالیہ (وائس چانسلر جودھ پور یونیورسٹی) جناب پی.اے. انعامدار (چیئرمین گولڈن جوبلی ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) ڈاکٹر علی جاوید (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) محترمہ بیلا بنرجی (جوائنٹ سکریٹری لینگویجز، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند) جناب ایس. کے. رے (جوائنٹ سکریٹری اور فنانشل ایڈوائزر، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند) جب کہ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ فنانس کمیٹی کے ممبر سکریٹری ہوں گے۔

'' اردو کی نئی بستیاں '' بین الاقوامی سیمینار

● نئی دہلی، 18 مارچ۔ '' اردو ہندستان کے عوام کی زبان ہے۔ تمام علاقائی بولیوں اور زبانوں کے ساتھ اردو کا رشتہ بہت گہرا ہے اور صحیح معنوں میں یہ ایک سیکولر زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ سچائی یہی ہے کہ اردو کے بغیر ہندستان ایک سیکولر ملک نہیں رہ سکتا۔'' ممتاز دانشور اور ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تین روزہ بین الاقوامی سیمینار '' اردو کی نئی بستیاں '' کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو کو ہندستان اور پاکستان کی تہذیبی، ثقافتی اور عوامی ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہندستان ہو یا پاکستان اردو ہی عوامی رابطے کی زبان ہے۔ ان دونوں ملکوں کے علاوہ دنیا بھر میں اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں جہاں زبان کو ہر سطح پر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ کناڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے کلیدی خطبے میں سوال اٹھایا کہ آئندہ 50 برسوں تک اردو کی یہ نئی بستیاں قائم رہ پائیں گی یا نہیں۔ اردو کو رومن رسم خط میں لکھنے سے کیا یہ زندہ رہ پائے گی۔ سید تقی عابدی نے جدید ٹیکنالوجی کے عہد میں اور اس کی مدد سے اردو کی تعمیر اور توسیع کے طریقے ڈھونڈنے کی ضرورت پر زور دیا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے لاس انجلس سے آئی ہوئی مہمان خصوصی نیر جہاں نے کہا کہ ہندستان میں جنم لے کر اردو زبان آج تمام دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اردو کی نت نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ امریکا کے مغربی ساحل پر اردو کا چراغ روشن ہے اور اس چراغ کو روشن کرنے میں اردو مرکز کا اہم ترین رول ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سچیدا نند نے استقبالیہ تقریر میں اردو کی تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی روایت پر روشنی ڈالی۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو کنوینر شین کاف نظام نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کا پہلا اجلاس '' باہر کی بستیوں میں اردو زبان کے مسائل '' کے عنوان پر تھا جس کی صدارت پروفیسر مغنی تبسم نے کی۔ اس اجلاس میں رضا علی عابدی (لندن)، خلیل الرحمن (نیویارک)، وکیل انصاری (نیویارک) اور آفاق احمد (بھوپال) نے مقالے پیش کیے۔ دوسرا اور تیسرا اجلاس برطانیہ میں اردو زبان و ادب کے لیے مخصوص تھا۔ ان دو اجلاسوں کی صدارت بالترتیب رضا علی عابدی اور پروفیسر قمر رئیس نے کی۔ ان اجلاسوں میں عبید صدیقی (دہلی)، عبدالغفار عزم (لندن)، صابر ارشاد عثمانی (لندن)، سیفی سرونجی (بھوپال)، غضنفر (لکھنؤ)، پروفیسر اسد الدین (دہلی)، شافع قدوائی (علی گڑھ)، نظام صدیقی (الہ آباد)، ف س اعجاز (کلکتہ) اور پروفیسر محمد شاہد حسین (دہلی) نے مقالے پڑھے۔

19 مارچ کو سیمینار کے دوسرے دن چار اجلاس ہوئے جن میں دو اجلاس امریکا اور کینیڈا میں اردو زبان و ادب کے لیے وقف تھے۔ عبدالرحیم عبد (نیویارک) نے '' امریکا کی اردو تنظیمیں '' عنوان کے تحت اپنے مقالے میں بتایا کہ امریکا میں گزشتہ 30 برسوں کے دوران مختلف اردو تنظیموں نے زبان کے فروغ میں اہم ترین رول ادا کیا ہے۔ امریکا میں تقریباً 30 لاکھ افراد اردو بولنے

والے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر رضوی نے کینیڈا کی اردو تنظیموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کی تنظیمیں مشاعروں کے ذریعے اردو کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ٹورنٹو میں غالب اکادمی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں سے بھی سامعین کو آگاہ کیا۔ بلراج کومل نے اپنے مقالے میں بیدار بخت کی اردو شاعری کے تراجم پر اور عبدالسنان طرزی نے سید تقی عابدی کی تصانیف پر گفتگو کی۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبداللہ اور نظامت ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے کی۔

پانچویں اجلاس کا موضوع بھی امریکا و کناڈا میں اردو زبان و ادب تھا جس کی صدارت ممتاز نقاد وارث علوی نے کی۔ اس میں عزیز پریہار نے ستیہ پال آنند کی نظم نگاری، عنبر بہرائچی نے منیب الرحمٰن کی شاعری، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے احمد مشتاق کی غزل گوئی اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے "لالی چودھری کا فکشن" عنوان کے تحت مقالے پیش کیے۔ شکیلہ رفیق نے کینیڈا میں اردو فکشن پر گفتگو کرتے ہوئے اختر جمال، معین اشرف، اکرام بریلوی، ڈاکٹر خالد سہیل اور کئی دیگر افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ چھٹا اجلاس باہر کی بستیوں میں اردو رسم الخط کے مسائل کے موضوع پر مبنی تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے کی۔ اس میں سید تقی عابدی، فرحت شہزاد، عبدالغفار عزم اور مناظر عاشق ہرگانوی نے مقالات پیش کیے۔ رضا علی عابدی، خلیل الرحمٰن، اطہر رضوی، وکیل انصاری، مولا بخش، غضنفر، بیگ احساس، زماں آزردہ نے بحث میں حصہ لیا۔ سیمینار کے چھٹے اجلاس میں باہر کی بستیوں میں اردو رسم الخط کے مسائل پر بحث ہوئی۔ جس کو سمیٹتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو اب ایک عالمگیر زبان بن چکی ہے لہٰذا اس کے مسائل بھی مختلف ملکوں میں الگ الگ ہیں۔ ان میں رسم الخط کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ اس مسئلے پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ زبانیں کسی حکم سے نہیں چلا کرتیں، وہ بولنے والوں کی ضرورتوں کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کی تعلیم کا تعلق ہے ہمیں اپنے رسم الخط کا تحفظ کرنا چاہیے۔ یورپ اور امریکا و کینیڈا میں البتہ اردو پر رومن کا دباؤ ہے۔ اس سے چشم پوشی ممکن نہیں۔

ساتویں اجلاس میں یاسمین بودھی نے ماریشس میں اردو اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے نعیمہ ضیاء الدین کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی۔

سیمینار کے آخری دن آٹھویں اجلاس میں اردو کی بیرونی بستیوں میں اردو صحافت، اخبارات اور رسائل و جرائد کے موضوع پر بحث ہوئی۔ رضا علی عابدی نے اردو کمپیوٹر کی آمد کو اردو طباعت و اشاعت کی دنیا میں ایک انقلاب قرار دیتے ہوئے بتایا کہ برطانیہ میں اردو اخبارات و رسائل کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے اور اردو روزناموں میں "جنگ" کو اہم مقام حاصل ہے۔ سید تقی عابدی نے کینیڈا میں اردو اخبارات کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ امریکہ سے شائع ہونے والے اردو ٹائمز کے ایڈیٹر خلیل الرحمٰن نے امریکہ میں اردو صحافت کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ آخری اور نویں اجلاس کا عنوان خلیجی ممالک اور مشرق وسطیٰ میں اردو تھا جس میں ناصر بغدادی نے "خلیجی ممالک میں شعر و ادب" گلزار جاوید نے خلیج میں اردو کی صورت حال" ڈاکٹر عالیہ امام نے "چین اور سوئٹزرلینڈ میں اردو اور اس کے مسائل"، ہمایوں ظفر زیدی نے "مسقط میں اردو" اور قمر رئیس نے سوویت یونین اور ازبکستان و تاشقند میں اردو سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ صلاح الدین پرویز نے سعودی عرب میں اردو شعر و ادب کا جائزہ پیش کیا۔

(قومی آواز نئی دہلی)

"پریم چند کا ادب: انسانیت کی دستاویز" پر ورکشاپ

● الہ آباد، 27 رفروری۔ حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد کے شعبۂ اردو، ہندی، قومی اردو کونسل اور یو.پی. اردو اکادمی کے مشترکہ تعاون سے 27-26 رفروری کو "پریم چند کا ادب: انسانیت کی دستاویز" کے عنوان سے دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ریحانہ طارق نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند ایسے ادیب ہیں جو پُر آشوب دور میں بھی ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور سیکولر ذہن لے کر چلے۔ انھوں نے گاؤں کی تہذیب و پس ماندہ طبقے کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کی۔ ورکشاپ کے مہمان خصوصی پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی وائس چیئرمین قومی اردو کونسل نے کہا کہ پریم چند چند جملوں میں اپنی تخلیق میں جان ڈال دیتے ہیں۔ انھیں دیہاتی تہذیب کا پورا منظر پیش کر دینے میں مہارت حاصل ہے۔ ان کی تصانیف ذہن کی تمام کھڑکیاں اس طرح کھول دیتی ہیں جہاں سے ہندستان کو قریب سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ اس موقعے پر اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر نجم الحسن نے بھی خطاب کیا۔ ورکشاپ کے سوونیر کا اجرا پروفیسر قمر رئیس نے کیا۔ ورکشاپ کا افتتاح کالج کے کمپیوٹر سینٹر کی کوآرڈینیٹر اور شعبۂ تاریخ کی ریڈر ڈاکٹر یوسفہ نفیس کی نگرانی میں تیار کردہ ویب سائٹ "پریم چند گنگا جمنی ویب سائٹ کے تانے بانے" کے ذریعے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا۔ اس پروگرام کی نظامت ناصحہ عثمانی نے کی اور شعبۂ ہندی کی لکچرر ڈاکٹر ریحانہ صدیقی نے شکریہ ادا کیا۔

اس ورکشاپ میں چھ اجلاس منعقد ہوئے۔ "زندگی کی کشاکش کے تانے بانے سے بنی پریم چند کی ادبی شخصیت" پر مبنی پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر راجندر کمار سابق صدر شعبۂ ہندی، الہ آباد یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل کالج، کولکاتہ کے ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے کی۔ اس سیشن میں وریندر کمار، ڈاکٹر ثنا

اگروال، زرینہ بیگم، ڈاکٹر کشور سلطانہ، موسی گھوش، ڈاکٹر کلپنا ورما اور ڈاکٹر رینو سنگھ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے جلسے کا عنوان ''پریم چند کا ادب اردو ہندی زبان کی یکجہتی کا سرچشمہ'' تھا جس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر شکیل صدیقی نے کی۔ اس سیشن میں جاوید نظر، ڈاکٹر راکیش نارائن دویدی، سوریہ نارائن اور ڈاکٹر ریحانہ صدیقی نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر یوسف نفیس نے کالج کے کمپیوٹر سینٹر میں پریم چند پر تیار کردہ ویب پیجز کمپیوٹر اسکرین پر پیش کیے۔

تیسرے اجلاس میں ''پریم چند کے ناولوں میں متوسط طبقے کی کشمکش کی عکاسی'' کے تحت ڈاکٹر حسینہ بانو، ڈاکٹر کملیش سنگھ، ڈاکٹر ناصحہ عثمانی، ڈاکٹر سورج سنگھ، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر رخسانہ ہادی اور آر۔ پی گنگوار نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ 27 رفروری کو چوتھا اجلاس منعقد ہوا جس کا موضوع ''معاشرتی برائیوں سے نبرد آزما قلم کا سپاہی'' تھا۔ اس کی صدارت پروفیسر فضل امام اور ڈاکٹر شکیل صدیقی نے کی۔ اس میں جناب دینا ناتھ، ڈاکٹر نیلم کیش، ڈاکٹر رام چندر، ڈاکٹر کمار یندر سنگھ سینگر، ڈاکٹر برجیش کمار نے مقالے پیش کیے۔

پانچواں اجلاس پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر فضل امام اور ڈاکٹر شکیل صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کا موضوع ''پریم چند کی کہانیوں میں حقیقت پسندی کا رجحان'' تھا جس میں ڈاکٹر آشا اپادھیائے، ڈاکٹر بجرنگ لال موریہ، ڈاکٹر قاضی عبدالہادی، ڈاکٹر رفیع اللہ، رقیہ راشد اور ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مقالے پیش کیے۔ چھٹا اجلاس بہ عنوان ''عہد ساز تخلیق کار: پریم چند'' پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور ڈاکٹر مشتاق علی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر راجیش چند پانڈے اور ڈاکٹر شاہینہ رضوی نے مقالے پڑھے۔

اختتامی جلسے کی مہمان خصوصی جسٹس پونم شریواستو، الہ آباد ہائی کورٹ تھیں اور صدارت پروفیسر ستیہ پرکاش مشرا صدر شعبۂ ہندی، الہ آباد یونیورسٹی نے کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ریحانہ صدیقی نے کی اور ناصحہ عثمانی نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

سارک مصنفین کا جشن

● علی گڑھ، 22 رمارچ۔ فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرز، نئی دہلی کی معاونت سے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نسیم احمد نے کی جبکہ کلیدی خطبات انتظار حسین (پاکستان)، اجیت کور (نئی دہلی)، محترمہ گیتا کیسرائی (نیپال)، کیسرا ابھیشکرا (سری لنکا) اور وصی احمد (بنگلہ دیش) نے پیش کیے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے ادب اور زندگی کے باہمی رشتے پر مدلل گفتگو کی اور بدلتے ہوئے عہد میں کہانیوں کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔

کلیدی خطبات کے تحت بنگلہ دیش کے کلچرل کاؤنسلر وصی احمد نے کہا کہ سارک ممالک میں ایک مشترکہ اشاعتی ادارہ ہونا چاہیے تاکہ ان ممالک کے ادیب ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اجیت کور نے تفصیل کے ساتھ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا کے ساتھ ہندستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے دانشوروں، نقادوں اور افسانہ نگاروں کا تعارف پیش کیا۔ ممتاز ادیبہ گیتا کیسرائی نے موجودہ عہد میں ادیب کی ذمے داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ بحیثیت ادیب ہم اپنے فریضے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ نمائندہ ادیب اور فلم ساز کیسرا ابھیشکرا نے کہا کہ اردو زبان کو بولنے اور سمجھنے سے قاصر ہونے کے باوجود وہ اس زبان کی شیرینی اور موسیقیت کو محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے فلسفیانہ انداز میں اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ انگریزی میں بولنے اور لکھنے کے باوجود دراصل میں اپنی مادری زبان کو ہی بنیادی حوالہ مانتا ہوں اور تخلیق ادب کے دوران ایک فنکار کے لیے یہ تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مشرقی روایت کے امین انتظار حسین نے علی گڑھ کے منفرد ماحول کو تہذیبی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی اور بتایا کہ شاعری کی مستحکم روایت کے ساتھ افسانوی ادب کی بھی اپنی ایک انفرادی روایت ہے۔

اس موقعے پر جناب نسیم احمد نے کہا کہ ادیب ہماری خواہشوں کا نقیب ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو بہتر بنانے میں ہر طرح سے معاون ثابت ہوتا ہے۔ سیمینار کا پہلا اجلاس ممتاز افسانہ نگار اسد محمد خاں (پاکستان) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں جیلانی بانو نے ''آج کا ادب'' پروفیسر رشید امجد نے ''معاصر پاکستانی افسانے''، پروفیسر مرزا حامد بیگ نے ''اردو افسانے کے اسالیب بیان'' سلام بن رزاق نے ''عصر حاضر کے چیلنج اور معاصر افسانہ'' اور ڈاکٹر غضنفر نے ''معاصر افسانے'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''ہندستانی زبانوں پر فارسی کے اثرات'' پر سیمینار

● علی گڑھ، 2 راپریل۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی جانب سے ''ہندستانی زبانوں پر فارسی زبان اور ثقافت کے اثرات'' پر منعقدہ تین روزہ بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مندوبین نے کہا کہ ایران کی زبان اور اس کی تہذیب و ثقافت کا دیرپا اثر ہندستانی زبانوں، اس کی تہذیب و تمدن اور طرز زندگی پر پڑا ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان قدیم اور گہرے تہذیبی روابط ہزاروں برس سے قائم ہیں۔ فارسی زبان تقریباً آٹھ سو سال تک ہندستان کی سرکاری زبان رہی ہے اور ہندستان کی تمام زبانوں پر اس کے

اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایرانی طرزِ تعمیر کے اثرات بھی ہندستان کی ہزاروں تاریخی عمارتوں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ خود ایران کے اسکالروں نے بھی سنسکرت سے فیض اٹھایا ہے اور رامائن، بھگوت گیتا اور دوسری کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ممتاز مورخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ ہندستان کی تہذیب صرف سرحدوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ امریکہ میں ہندستان کے سابق سفیر ڈاکٹر عابد حسین نے کہا کہ فارسی زبان ہندستان میں ایک نئی زبان کے طور پر آئی اور اس نے دلوں کو جوڑا اور اس کی شاعری نے محبت کا پیغام دیا۔ ہندستان میں فارسی زبان کے اثرات سے ہی ایک نئی زبان اردو وجود میں آئی۔ سیمینار کے ابتدا میں شعبۂ فارسی کی سربراہ پروفیسر آزری دخت صفوی نے کہا کہ زمانۂ قدیم سے ہندستان اور ایران کے درمیان ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ ہندستان کی جڑی بوٹیوں کو ایران میں بھیجا جاتا تھا اور پنچ تنتر کا ایران میں فارسی ترجمہ کرایا گیا تاکہ ہندستان کی تہذیب وثقافت سے ایران کے لوگ متعارف ہوسکیں۔ ہندستان میں ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر ایم شفیع شکیب نے کہا کہ فارسی ثقافت کی زبان ہے۔ ایرانی اسکالر پروفیسر مہدی حسن نے ہندستان اور ایران کے درمیان ثقافتی رشتوں کو پھر سے مضبوط کرنے پر زور دیا۔ شیراز کے پروفیسر منصور راستگر فسائی نے فارسی زبان کی تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ افتتاحیہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نسیم احمد نے ایران اور ہندستان کے درمیان رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے نئے میدان تلاش کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر اسد علی خورشید نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر سید محمد طارق حسن نے شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''ترجمہ نگاری، ذرائع ابلاغ اور زبان'' پر قومی سیمینار

● نئی دہلی، 22/مارچ۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام یو.جی.سی. اسپیشل اسسٹینس پروگرام کے تحت ''فنِ ترجمہ نگاری، ذرائع ابلاغ اور زبان'' کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار کا افتتاحی اجلاس، خیابانِ اجمل میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر ایم سی آر سی، جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر افتخار احمد نے کہا کہ ذرائع ابلاغ اور زبان میں گہرا رشتہ ہے، لیکن الیکٹرانک میڈیا نے تصویروں کو اولیت دے کر لفظوں کو ثانوی درجے پر پہنچا دیا ہے۔ پروفیسر اسد الدین نے ترجمے کے ضمن میں ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی ملفورٹ ولیم کالج، انجمن پنجاب، دارالترجمہ حیدرآباد، سائنٹفک سوسائٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کو اردو زبان میں بیش بہا اضافہ قرار دیا۔ صدارتی خطاب میں ہندی کے نامور ادیب اشوک واجپئی نے کہا کہ میڈیا لسانی جمہوریت کی تشکیل کرتا ہے، لیکن جب سے ہندستان میں میڈیا کا سیلاب آیا ہے تب سے الفاظ کم ہوگئے ہیں۔ میڈیا نے لوگوں کو لفظوں سے محروم کردیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میڈیا میں تن آسانی ہی کی وجہ سے کام چلاؤ زبان کو فروغ مل رہا ہے، جس کے لیے عوام بھی ذمے دار ہیں۔ پروفیسر واجپئی نے کہا کہ عالمی ادب کا کوئی تصور ترجمے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی عبید الرحمان ہاشمی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

23/مارچ کو سیمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت چودھری محمد نعیم (پروفیسر ایمریٹس شکاگو یونیورسٹی) اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر کوثر مظہری نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر رویندر گرگیش نے ''ترجمہ نگاری کے جدید نظریات ورجحانات'' پروفیسر نقی حسین جعفری نے ''اردو شاعری کے ترجمے کے مسائل'' ڈاکٹر احمد محفوظ نے ''اردو میں لفظی ترجمے کے مسائل'' ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے ''سید عابد حسین کی ترجمہ نگاری'' اور عمیر منظر نے ''اردو میں قرآنی ترجمے کی روایت'' کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ترجمہ ہمیں ایک نئی دنیا سے واقف کراتا ہے اور کبھی کبھی تو مترجم اپنی تخلیقیت سے اصل متن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ چودھری محمد نعیم نے کہا کہ ترجمہ دراصل ایک تخلیق کار کا دوسرے تخلیق کار سے مکالمہ ہے، جسے جاری رہنا چاہیے۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر شہپر رسول نے ابتدائی کلمات میں حاضرین کا خیر مقدم کیا۔

دوسرا اجلاس ماہرِ لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں پروفیسر صادق نے ''عوامی ذرائع ابلاغ کی زبان: ماضی اور حال'' ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے ''ریڈیائی فیچر اور تقاریر کا فن'' پروفیسر عبید صدیقی نے ''مختلف ٹی وی چینلوں میں زبان کا استعمال اور امتیاز'' انجم عثمانی نے ''ٹیلی ویژن نشریات میں اشتہار کی اہمیت'' اور ''ڈاکٹر رضوان الحق نے ''ٹیلی فلم اور ٹیلی ڈرامے میں زبان کا استعمال'' پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شہزاد انجم نے کی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور پروفیسر شمیم حنفی نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابن کنول نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں سہیل انجم نے ''اداریہ نویسی: فن اور روایت''، ڈاکٹر خالد محمود نے ''اردو میں کالم نگاری کا فن اور صورت حال آزادی سے قبل''، زبیر رضوی نے ''ذرائع ابلاغ اور زبان'' اور اقبال مجید نے ''مکالمہ نگاری کا فن اور اس کا کمال'' موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اداریے کی مدد سے ہم اپنے عہد کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ماس میڈیا میں تصویر کی طاقت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اشتہار کو انھوں نے تہذیب پر حملے کی ایک شکل قرار دیا۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے نیوز چینلوں سے ختم ہوتی خبروں پر اپنی تشویش کا

اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کل نیوز کی بجائے تبصرے سننے کو ملتے ہیں۔

چوتھا اجلاس پروفیسر عبدالحق اور زبیر رضوی کی صدارت میں ہوا، جس کی نظامت ڈاکٹر احمد محفوظ نے کی۔ اس موقعے پر نجمہ انجم نے ''اردو ترجمہ نگاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ''، ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے ''آغا حشر کاشمیری کی اردو ترجمہ نگاری''، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے ''اردو میں ترجمہ نگاری کے مسائل اور صورتِ حال'' موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ پروفیسر عبدالحق نے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق اور ترجمہ دونوں میں زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس پر دسترس نہیں ہو تو ترجمہ ہو یا تخلیق کوئی بھی اعتبار حاصل نہیں کرسکتا۔ زبیر رضوی نے کہا کہ گلوبلائزیشن کی وجہ سے زبان، تہذیب اور ثقافتی ورثہ سبھی کو خطرہ لاحق ہے۔ سیمینار کا اختتامی اجلاس جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس کی نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ سید حامد نے کہا کہ قوم کی ترقی وکامرانی میں تراجم کا غیر معمولی رول رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو توانا اور متمول بنانے کے لیے ہندستان کی دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنا چاہیے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کلمات تشکر ادا کیے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

مذاکرہ ''نئی صدی میں ادب کو درپیش چیلنج''

● ممبئی، 8/ مارچ۔ اردو پریس کلب، دہلی کی جانب سے انجمن اسلام میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک سیمینار منعقد ہوا جس کے موضوعات تھے ''نئی صدی میں ادب کو درپیش چیلنج''، ''ممبئی میں اردو ادب کی صورتِ حال'' اور ''اردو کلچر، فلم اور میڈیا''۔ پہلے جلسے کی صدارت جناب اسحاق جمخانہ والا نے کی اور اس میں معروف ناول نگار پیغام آفاقی نے "The Hanging Man" کے عنوان سے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب انسانی تہذیب کی تربیت کرتا ہے اور مکتب سے لے کر آخری سانس تک انسانی قدروں کے معاملے میں سماج کے ہر طبقے کے افراد کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ادیب کے لیے ضروری ہے کہ آج کی زندگی میں الفاظ، خیالات اور فکر واحساس میں تشدد اور سفاکی کے پھیلے ہوئے زہر پر اس کی نگاہ ہو تا کہ اس کے ذریعے تخلیق کیے گئے افسانوی اور فلمی کرداروں میں لاشعوری طور پر یہ زہر داخل نہ ہو جائے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ہمیں آج ایسے ادب کی ضرورت ہے جس کی جڑیں ہندستانی تہذیب میں پیوست ہوں۔ جناب شعیب رضا نے کہا کہ انسانی زندگی کے اندر جس طرح درندگی داخل ہوئی ہے اس کی وجوہات پر غور کرنا ادیبوں کا مشن ہونا چاہیے تبھی انسانی درد سے لبریز فن پارے تخلیق کیے جاسکیں گے۔ جناب فیاض رفعت نے کہا کہ پیغام آفاقی نے ''لٹکا ہوا انسان'' میں جو کچھ کہا ہے اس میں انسانی نجات کو درپیش چیلنج کو ہی ادب کا چیلنج قرار دیا گیا ہے۔ ریسرچ اسکالر ممتاز عالم نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔

اس موقعے پر جناب اسحاق جمخانہ والا نے کہا کہ پوری دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ادیبوں اور مفکروں نے سماج کو اس کے دکھ درد کی کہانیوں سے نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ انھوں نے والٹیر اور روسو کی مثالیں دیں جو انقلاب فرانس کا پیش خیمہ بنے تھے۔

دوسری نشست کی صدارت مشہور افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی نے اور نظامت ماہنامہ ''شاعر'' سے وابستہ حامد اقبال صدیقی نے کی۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے ممبئی میں ادب کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر جناب حسن کمال نے کہا کہ اہم سوال یہ ہے کہ انگریزی کی تعلیم انگریزی جاننے کے لیے ہونی چاہیے یا انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم بن جائے۔ انھوں نے خبردار کیا کہ زبان کو قربان کرکے انگریزی پڑھانے کا عمل ہماری اگلی نسل کو ادبی طور پر یتیم کردے گا۔ ممتاز عالم نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ آج لائبریری میں کتابیں ہیں لیکن پڑھنے والے نہیں ہیں۔ جلسے میں جناب فیاض رفعت اور عبدالاحد ساز نے بھی اظہار خیال کیا۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی نے کہا کہ اردو زبان انسانوں کی طرح اپنی شکل وصورت بدلتی رہی ہے اور اردو والوں کے جسم میں خون نہیں اردو گردش کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے اندر اتنی قوت ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر زندہ رہ سکتی ہے۔

آخری جلسے کی صدارت جناب پیغام آفاقی نے کی اور اس میں مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے مشہور فلم ڈائرکٹر جناب مہیش بھٹ اور اسکرپٹ رائٹر جاوید صدیقی نے شرکت کی۔ جلسے کی نظامت مشہور ڈراما نگار اور ڈائرکٹر جناب مجیب صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر جناب مہیش بھٹ نے کہا کہ اردو میری ماں کی زبان ہے۔ دنیا میں زبانیں پیدا ہوتی ہیں، استعمال ہوتی ہیں اور پھر مندمل ہوکر کھو جاتی ہیں۔ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی روح اور اس کا چہرہ ہے جس کے ذریعے وہ پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنی مادری زبان میں زیادہ بہتر طور سے باتوں کو سمجھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سنیما کے ذریعے بھی اردو زبان کو تقویت دی جاسکتی ہے۔ جناب جاوید صدیقی اور امتیاز حسین نے بحث میں حصہ لیا۔

جناب پیغام آفاقی نے کہا کہ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ زبانیں کیوں مرتی ہیں اور اردو کیسے زندہ رہے گی۔ اردو شروع سے ہی عوامی رابطے کی زبان رہی ہے اور اس کی بقا بھی اسی میں ہے کہ اس زبان کو عام فہم اور عام آدمی کی زبان بنائے رکھا جائے۔ آخر میں اردو پریس کلب کے سکریٹری جناب طارق فیضی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

فاصلاتی نظام تعلیم اور اردو پر سیمینار

● نئی دہلی، 22 / مارچ۔ اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے "فاصلاتی نظامِ تعلیم اور اردو" کے عنوان سے 19 تا 20 / مارچ دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح کرتے ہوئے فاصلاتی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر ایس. بی. گرگ نے اردو کے ذریعے فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی چونکہ اردو کے ذریعے ہی تعلیم دے رہی ہے اس لیے اس سے نہ صرف تعلیم عام ہو رہی ہے بلکہ اردو زبان کا فروغ بھی ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے ذریعے تکنیکی تعلیم یعنی میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ کے امکانات پر بھی غور کرنا چاہیے اور عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ ذخیرہ حاصل کرکے نئے سرے سے مرتب کرنا چاہیے جو تکنیکی تعلیم سے متعلق تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جانکی راجن نے اس تعلیم کے لیے سہل زبان میں نصاب تیار کرنے کا مشورہ دیا تاکہ اسے ہر طبقے کا فرد آسانی سے سمجھ سکے۔ جناب م. افضل نے خیر مقدمی تقریر کی اور سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر شاہد پرویز نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔

سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر شافع قدوائی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے سمعی و بصری نظام میں اردو کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اردو کا چلن عام کرنے کے لیے اس تعلیم کو عام کرنا بہت ضروری ہے۔ اراکینِ مجلسِ صدارت میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر وہاج الدین علوی اور پروفیسر نجمہ اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے انجام دی۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر ظہورالدین، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر عبدالرشید، ڈاکٹر سبحان کور، ڈاکٹر نظام الٰہی اور ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے اپنے مقالات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ تمام تعلیمی ادارے جو اس سمت میں کام کر رہے ہیں ان میں ہم آہنگی بہت ضروری ہے تاکہ طلبہ کسی شک و شبہے کا شکار نہ ہوں۔ اراکین مجلس صدارت میں پروفیسر اشتیاق عابدی، پروفیسر صادق، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ابن کنول، جناب اظہار عثمانی اور پروفیسر محمد اسلم شامل تھے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

"مولانا عبدالماجد دریابادی اور اردو صحافت" پر مذاکرہ

● بارہ بنکی، 17 / مارچ۔ "مولانا عبدالماجد دریابادی نے اردو صحافت میں درخشاں اور تابناک روایتیں قائم کیں اور صحافت کے نہ صرف زریں اور رہبر اصول مرتب کیے بلکہ ان پر خود چل کر دکھایا۔ انھی رہبر اصولوں پر عمل پیرا ہو کر صحافی کو درجۂ کمال حاصل ہو سکتا ہے۔" مولانا عبدالماجد دریابادی کے 113 ویں یوم ولادت کے موقعے پر رابطہ سیوا اسنستھان کی جانب سے منعقدہ سیمینار "مولانا عبدالماجد دریابادی اور اردو صحافت" کے موضوع پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے سابق ممبر پارلیمنٹ محمد ہاشم قدوائی نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ جناب ہاشم قدوائی نے کہا کہ مولانا کی صحافت ہمیشہ سچ کی علمبردار رہی اور ان کی صحافت کا اصل مقصد اسلام اور مشرقی قدروں کی حفاظت تھا۔ اس سیمینار کی مہمانِ خصوصی سابق صدر اردو اکادمی اتر پردیش بیگم حامدہ حبیب اللہ نے کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی ایک مایہ ناز مفسر، ایک باکمال تذکرہ نگار، ایک اہل نظر عالم اور ایک صاحب فکر فلسفی تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کی تحریر کا اصل جوہر اس کی علمیت اور ایک ایسا طرز ہے جو دلکشی اور تاثرات میں اپنی ایک خاص چھاپ چھوڑتا ہے۔ شافع قدوائی نے اپنے مقالے میں اردو صحافت کے مزاج اور اس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کا آغاز احتجاج سے ہوا مگر مولانا عبدالماجد دریابادی نے پہلی مرتبہ اپنے اخبار کے ذریعے "سچی باتیں" کالم میں علمی تصور دیا جس سے اسلوب کی سطح پر نمایاں تبدیلیاں نظر آئیں۔ عمیر الصدیق دریابادی نے مولانا کے معرکۃ الآرا مضامین کا حوالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان میں صحیح مذہبیت کے ساتھ وطن دوستی، علم و اخلاق کی مستند قدریں موجود ہیں۔ خبروں پر تبصرے، مراسلوں کے جوابات، مشوروں، گزارشوں، کتابوں اور رسالوں پر تبصرے، مضامین اور مقالوں کو مولانا اس خوبصورتی سے دس بارہ صفحات میں اس طرح سموتے تھے کہ ہر تحریر بلکہ ہر سطر سے قاری لطف اندوز ہوتا تھا۔ مولانا نے مسلسل 52 برسوں تک قصبہ دریاباد میں بیٹھ کر ادب، فلسفہ، انشا اور مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کامیابی کے ساتھ 1925 سے پہلا ہفتہ وار اخبار "سچ" پھر "صدق" اور "صدق جدید" کے ذریعے اصلاح مشاعرہ، تحفظ دین اور ہندو مسلم اتحاد کو قائم و دائم رکھنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سردار پٹیل مہیلا ڈگری کالج کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صفت الزہرہ نے مولانا کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی طرز صحافت پر روشنی ڈالی۔ مولانا مشتاق ندوی اور مولانا شکیل احمد دریابادی نے بھی سیمینار میں اپنے مقالے پیش کیے۔

(ترجمان، علی گڑھ)

"آزادی کے بعد کرناٹک میں اردو شاعری" پر مذاکرہ

● گلبرگہ، 18 / مارچ۔ "کرناٹک میں اردو شاعری کو آزادی کے بعد زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس خیال کا اظہار ممتاز قانون داں اور کانگریسی رہنما جناب سعادت حسین استاد نے انجمن ترقی اردو اور اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ کی طرف سے خواجہ بندہ نواز ایوان اردو، اسٹیشن روڈ پر منعقد "کرناٹک میں اردو شاعری۔ آزادی کے بعد" سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد) نے کلیدی خطبے

میں کہا کہ گلبرگہ اور اردو کے مراکز پر حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کی تحریروں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ اس موقعے پر گزشتہ برس گلبرگہ میں منعقدہ سیمینار کے مقالوں کے مجموعے ''دکنی آغاز و ارتقا'' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر عبدالکریم کاظمی نے اس کتاب کو اردو ادب کے طالب علموں تک پہنچانے کا مشورہ دیا۔

پروفیسر حمید سہروردی اور جناب وہاب عندلیب (کنوینر سیمینار و سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی) نے بھی سامعین کو خطاب کیا۔ ڈاکٹر مہاراج کرشن کول نے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کی کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی۔

جناب شریف احمد قریشی (صدر انجمن) نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ حکومت ہند بھی کوششیں کر رہی ہے کہ اردو زبان کو فروغ حاصل ہو اس سلسلے میں اردو داں طبقے کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ جناب ولی احمد (نائب صدر انجمن) نے نظامت کے فرائض انجام دیے، خیر مقدم جناب امجد جاوید (نائب صدر) نے کیا۔

19 ؍مارچ کو پروفیسر قیوم صادق کی صدارت میں پہلا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی (بیدر) نے ''کرناٹک میں اردو شعری روایات'' ڈاکٹر رفعت النسا بیگم نے ''کرناٹک میں اردو نظم نگاری'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے اور ڈاکٹر فہیم پیرزادہ نے مقالوں پر تبصرے کیے۔ اجلاس دوم پروفیسر حمید سہروردی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ''کرناٹک میں اردو غزل'' جناب حامد اکمل نے ''کرناٹک کے چند نظم گو شعرا'' اور پروفیسر خالد عرفان نے ''اردو شاعری کے ارتقا میں کرناٹک کا حصہ'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ افتخار الدین اختر نے مقالوں پر تبصرہ کیا۔ نظامت اور شکریے کے فرائض میر شاہنواز خاں شاہین نے انجام دیے۔

تیسرا اجلاس 20 ؍مارچ کو پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی صدارت میں شروع ہوا جس میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری (بنگلور) نے ''کرناٹک کی نمائندہ شاعرات''، ڈاکٹر اکرام باگ نے ''کرناٹک کے چند اہم جدید شعرا''، پروفیسر حمید سہروردی نے ''کرناٹک کا شعری ادب۔ جدید رجحانات'' اور پروفیسر خالد سعید نے ''نصاب میں شامل کرناٹک کے شعرا کی تخلیقات کا جائزہ'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ اجلاس کے آغاز میں جناب وہاب عندلیب نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ نظامت اور اظہارِ تشکر جناب امجد جاوید نے کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت جناب شریف احمد قریشی نے کی۔ جناب حامد اکمل نے اس موقعے پر انجمن ترقی اردو سے گزارش کی کہ تعلیمی ماہرین کی ایک تعلیمی کمیٹی بنائی جائے جس سے تعلیم کو فروغ و توسیع حاصل ہو سکے۔ جناب اقبال احمد سرڈگی (رکن پارلیمان گلبرگہ) نے کہا کہ کرناٹک میں آزادی کے بعد شعرا اور ادبا کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ ملک و سماج کی تعمیر میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے سرو شکشا ابھیان کے تحت اردو مراکز کے لیے علاحدہ فنڈ کے اختصاص کی مانگ کی۔ مہاراجہ کرشن کول، جناب عبدالحمید اور قمر الاسلام (سابق وزیر حکومت کرناٹک) نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ ڈاکٹر رفیق رہبر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

یوم اردو کا انعقاد

● نئی دہلی، یکم اپریل۔ ''یومِ اردو'' کے موقعے پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں نیشنل اردو فورم کی طرف سے منعقدہ جلسے میں فورم کے صدر ڈاکٹر انور پاشا نے مرکزی حکومت سے اردو کو قومی سطح پر سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ کیا اور اس مطالبے کے حصول کے لیے اردو والوں سے متحد ہو کر جدو جہد کرنے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے جمہوری و آئینی حقوق کے حصول کے لیے مجاہدانہ حکمتِ عملی تیار کرے اور اپنے جائز حقوق کے لیے جدو جہد کا راستہ اختیار کرے۔ پروفیسر محمد حسن نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو کش قوتوں سے محتاط رہنے اور مستقبل میں اردو کے تحفظ و بقا کے لیے منصوبے تیار کرنے پر زور دیا اور اردو والوں کو اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ اردو کے معیار کو عالمی پیمانے پر بلند کرنے اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے عملی اقدام پر مستعد ہوں۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ 31 ؍مارچ کو مجاہد اردو دیونارائن پانڈے نے اردو کے حق کے لیے اپنی شہادت دے کر ایک نادر مثال قائم کی اور اس دن کو یومِ اردو کے طور پر منایا جانا یقیناً بامعنی اور مستحسن ہے۔

پروفیسر شاہد احمد شعیب نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان کی وکالت کرنے والے دراصل اس ملک کی مشترکہ تہذیبی فضا کے دشمن ہیں۔ جلسے میں پروفیسر نصیر احمد خاں اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے بھی خطاب کیا۔

جلسے کے اختتام پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام اردو آبادی والے علاقوں میں قائم کیندریہ ودیالیوں اور نوودیہ ودیالیوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنانے کے ساتھ ہی ساتھ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ نیشنل اوپن اسکول کی طرز پر نیشنل اوپن اردو اسکول قائم کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا تاکہ اردو تعلیم کی سہولتیں اردو والوں کو میسر ہو سکیں۔ دہلی میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے جہاں جہاں اردو داں ملازمین کی ضرورت ہے ان جگہوں پر فوراً تقرری اور دہلی کے تمام سرکاری اسکولوں میں کم از کم ایک ایک اردو استاد بحال کرنے اور جن اسکولوں میں اردو کی اسامیاں خالی پڑی ہیں ان کو فوری طور پر پُر کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ (قومی آواز، دہلی)

مذاکرہ ''غالب اور کلکتہ''

● نئی دہلی، 31 / مارچ۔ 28-29 / مارچ کو غالب انسٹی ٹیوٹ اور کلکتہ یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے ''غالب اور کلکتہ'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مغربی بنگال کے وزیرِ محنت محمد امین نے کہا کہ غالب کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی دکھائی دیتی ہے۔ سماج سے جڑے ہوئے ہر فرد نے غالب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''غالب کا سفرِ کلکتہ'' اور ''کلکتے کا ادبی معرکہ'' کا اجرا بھی کیا۔ اس سے قبل کلکتہ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر سرنجن داس نے اس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان نہ صرف ہمارا قیمتی سرمایہ ہے بلکہ ہندستان کے ہر اس فرد کی زبان ہے جو اس ملک کی جمہوریت اور سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنی تقریر میں کہا کہ غالب کا سفرِ کلکتہ ان کی زندگی کا ایک خاص پہلو تھا۔ اس زمانے کا کلکتہ بڑا علمی و ادبی مرکز تھا۔ لہٰذا اس شہر سے وابستگی فطری تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی گفتگو میں غالب کے سفرِ کلکتہ کے حوالے سے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر اجول باسو نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر شہناز نبی صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی نے اس جلسے کی نظامت کی۔ سیمینار کے دوسرے دن کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم اور شاہد ماہلی نے کی۔ پہلے اجلاس میں جناب ندیم احمد، مسٹر الیاس شیخ، ڈاکٹر عقیل احمد اور مولانا اے ایم کے معصومی نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر رضا حیدر اور ڈاکٹر شہناز نبی نے مقالے پڑھے۔ (قومی آواز، دہلی)

مذاکرہ ''اردو تعلیم اور کمپیوٹر''

● حیدرآباد، 21 / مارچ۔ اردو تعلیم میں کمپیوٹر کے موقف پر ایک قومی سیمینار جناب محمد جلیل پاشا، بانی و صدر نشیں کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی و کالج ڈیولپمنٹ کمیٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل اور پروفیسر ڈی رام چندرم، وائس چانسلر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو والے ہرگز احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں اور آج یہ زبان ٹیکنالوجی سے جڑ گئی ہے۔ اس طرح اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مارکیٹ میکنزم کچھ اس طرح کا ہے کہ اسے روزگار سے جوڑنا کسی قدر مشکل ہے لیکن کونسل نے اپنے طور پر اس کے لیے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مرکزی حکومت کی پالیسی بھی اردو کی ترویج و ترقی میں معاون ہے اور اسے قومی کم از کم مشترکہ پروگرام میں شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی سیکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا کیونکہ انگریزی عالمی زبان ہے۔ انھوں نے اردو اساتذہ کو یوم اساتذہ کے موقعے پر اعزازات دینے اور جنوبی ہند کی شاخ میں پانچ فیلوشپ کا تقرر عمل میں لانے کا اعلان کیا تاکہ اردو ذریعہ تعلیم کے موجودہ مسائل حل کیے جاسکیں۔

پروفیسر ڈی رام چندرم نے اس موقعے پر کہا کہ اردو اس ملک کی اہم زبان ہے اور امبیڈکر اوپن یونیورسٹی اردو زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہی ہے اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اردو نصابی کتب فراہم کر رہی ہے۔

جناب محمد جلیل پاشا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو زبان آج خواتین ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔ انھوں نے اردو نصابی کتابوں کی وقت پر فراہمی اور اردو طلبہ کے لیے بہتر روزگار کے مواقع مہیا کرانے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی کمیٹی کی موثر نمائندگی کی وجہ سے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ جناب عابد صدیقی، نیوز ایڈیٹر دوردرشن، پروفیسر ملا ریڈی، جناب عرفان اللہ، ڈاکٹر یوسف کمال (مشیر قومی اردو کونسل، شاخ جنوبی ہند) محترمہ فاطمہ، جناب رئیس اختر، جناب پریم راج یادو، ڈاکٹر سید علی نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ جناب احمد محی الدین، ڈپٹی ڈائرکٹر اعلا تعلیمات نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ ''علی گڑھ تحریک کی نئی جہتیں''

● نئی دہلی، 22 / مارچ۔ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملک کی قیادت کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ ماضی میں ہندستان کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا وہ علی گڑھ تحریک کے نتائج سے ہی ممکن ہوسکا۔ موجودہ دور میں اسے مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔'' ان خیالات کا اظہار سرسید فاؤنڈیشن کی طرف سے اردو اکادمی دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے خیابان اجمل میں منعقدہ سیمینار بعنوان ''علی گڑھ تحریک کی نئی جہتیں'' کے دوران اپنی صدارتی تقریر میں وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کیا۔ محمد نسیم فاروقی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ آج ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی جیسے مزید ادارے ملک میں قائم کیے جائیں تاکہ ملک اور قوم کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔ خواجہ محمد شاہد صدر سرسید فاؤنڈیشن نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ کچھ کوتاہ نظر سرسید تحریک کو دو قومی نظریے سے جوڑتے ہیں۔ اس لیے آج ضرورت ہے کہ تحریک کے مثبت

پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر اسعد علی نے کی۔ پروفیسر اصغر عباس نے اپنے مقالے میں سرسید کی صحافتی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ جاوید حبیب دہلی، احمد نعمانی، نفیس عباسی نے بھی سیمینار میں اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے تیسرے اجلاس کا عنوان تھا "سائنٹفک ٹمپرامنٹ کے ذریعے ہماری ترقی کس طرح ممکن ہوسکتی ہے۔" اس عنوان کے تحت پروفیسر افتخار عالم خاں، پروفیسر زید رحمٰن، ڈاکٹر ظفر محمود، پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے اختتام پر خواجہ محمد شاہد صدر سرسید فاؤنڈیشن نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سیمینار "عالمگیریت کے تناظر میں اعلا تعلیم کے تقاضے"

● علی گڑھ، 7 رمارچ۔ ہندی کے ممتاز اسکالر اور مہاتما گاندھی ہندی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اشوک باجپئی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اکادمک اسٹاف کالج میں "عالمگیریت کے تناظر میں اعلا تعلیم کے تقاضے" پر مذاکرے کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اعلا تعلیم ذہن کے دریچوں کو کھولتی ہے اور روشن خیالی پیدا کرتی ہے مگر ہندی علاقوں میں جس طرح کا تعصب ہے اس میں اعلا تعلیم کا مقصد پوری طرح سے ناکام رہا ہے۔ انھوں نے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم میں تبدیلی کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ اعلا تعلیم کے اداروں کو نئے افکار ونظریات کو فروغ دینا چاہیے اور طلبہ میں تعلیم کے تئیں تجسس پیدا کرنا چاہیے اور انھیں اس لائق بنانا چاہیے کہ ان کا ذہن تنقیدی ہو اور سوال کرتے وقت ان کی حوصلہ افزائی ہو۔

افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کہا کہ ہندستان میں تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تجربہ گاہوں میں نئے تحقیقی انکشافات نہیں ہو رہے ہیں۔ این سی ای آر ٹی کے سابق ڈین اور ماہر تعلیم پروفیسر آر پی سنگھ نے کہا کہ موجودہ دور میں ہندستان کی یونیورسٹیوں کا کردار بہت تیزی سے بدل رہا ہے اور یہ دانش گاہیں جو علوم وفنون کا مرکز ہوا کرتی تھیں آج ٹیکنیکل کالج کے مراکز بنتی جارہی ہیں اور تعلیمی ادارے لوگوں کے گھروں تک دستک دے رہے ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ایس عبدالکریم نے اساتذہ کو کمپیوٹر خواندہ بنانے اور سماج کی بدلتی ہوئی قدروں کے مطابق طلبہ کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ تدریس وتحقیق میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال کی ضرورت پر زور دیا۔ اس سے قبل اکادمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس مذاکرے کا بنیادی مقصد تعلیم کے میدان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق تبادلۂ خیال کرنا ہے تاکہ یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کا معیار تعلیم بلند ہوسکے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو پریس کلب کا جلسہ

● نئی دہلی، 9 رمارچ۔ "زبان ایک انسان کی روح کی طرح ہوتی ہے اور اس کے مٹنے کا مطلب انسان کا مٹ جانا ہے۔ اردو کی سب سے بڑی مشکل اردو دشمنی ہے جو اردو کو تقسیم سے جوڑنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔" ان خیالات کا اظہار ممتاز فلم ہدایت کار مہیش بھٹ نے انجمن اسلام، ممبئی میں اردو پریس کلب، دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقدہ ایک روزہ مذاکرے میں کیا۔ مشہور کالم نویس حسن کمال نے کہا کہ جس انگریزی زبان کو ضرورت کے تحت پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ہماری مادری زبان اور ادب کو ہماری زندگی سے بے دخل کرتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جس کی جڑیں ہندستانی زندگی اور سوچ میں پیوست ہوں۔ نشست کے صدر پیغام آفاقی نے کہا کہ ادب اور فلم میں ایسے کرداروں کو ابھارنے پر نظر ثانی کرنی چاہیے جو اپنے مسائل کو تشدد کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔ ناولوں اور فلموں میں سوچنے سمجھنے اور قربانی دینے والے کرداروں کی تخلیق ضروری ہے۔

اس موقعے پر انجمن اسلام کے صدر اسحاق جمخانہ والا نے اردو پریس کلب کی کوششوں کی ستائش کی۔ مذاکرے میں ممتاز انور، فیاض رفعت، فصیح اکمل، ڈاکٹر کلیم رضا، سلمٰی صدیقی، عبدالاحد ساز، قسیم طارق، یعقوب راہی، غلام نبی مومن، نورالعین، کمل مینائی، مقدر حمید، پپو پالیسٹر، حامد اقبال، آر کے نیر، پروفیسر سعید احمد، مجاز کانپوری وغیرہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

صدر جمہوریہ کو ان کی منظومات کا اردو ترجمہ "میرا سفر" پیش

● نئی دہلی، 18 رمارچ۔ معروف شاعر شکیل شفائی نے صدر جمہوریہ ہند جناب اے پی جے عبدالکلام کو ان کی منظومات کا اردو ترجمہ "میرا سفر" پیش کیا۔ اس موقعے پر ان کے ہمراہ اترپردیش اردو اکادمی کے صدر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر مظفر حنفی اور پروفیسر قمر رئیس موجود تھے۔ صدر جمہوریہ نے اردو میں اپنے کلام کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا اور شکیل شفائی سے اپنی ایک نظم کا اردو ترجمہ سنا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جلسہ تقسیم انعامات واسناد

● گلبرگہ، 2 رمارچ۔ انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کا جلسہ تقسیم انعامات واسناد 22 رفروری کو خواجہ بندہ نواز ایوان اردو میں زیر صدارت جناب

شریف احمد قریشی صدر انجمن منعقد ہوا۔ مہمانان خصوصی جناب اقبال احمد سرڈگی رکن پارلیمان، جناب وہاب عندلیب، جناب محمد مصلح الدین ڈپٹی کمشنر کمرشیل ٹیکس اور ممتاز ماہر قانون جناب سعادت حسین نے طلبہ وطالبات میں انعامات و اسناد کی تقسیم کی۔ یہ انعامات و اسناد عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ و روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کی جانب سے شاہین اسکول سے اردو میڈیم ایس ایس ایل سی میں زیادہ نمبر حاصل کرنے پر سید ناطق الدین کو گولڈ میڈل، زینت النسا بیگم اور سید جنید علی کو سلور میڈل، ریاستی سطح پر جناب قمرالاسلام سابق وزیر حکومت کرناٹک کی جانب سے پانچ ہزار روپے ریاست بھر میں اوّل اردو اینگلو ہائی اسکول ڈانڈیلی کے فضل الرحمٰن قاضی کو ایس ایس ایل سی میں زیادہ نشانات پر اور ضلعی سطح پر جناب اقبال احمد سرڈگی البدر ایجوکیشنل ٹرسٹ، گلبرگہ کی جانب سے پانچ ہزار روپے نقد انعام ضلعی سطح پر ایس ایس ایل سی میں اوّل، دوم اور سوم کے لیے روشن شا الامین گرلز اسکول خونی الادہ، خان شمیم بیگم الامین اسکول جیورگی کالونی اور محمد عبدالقادر گورنمنٹ اسکول الند کو انعام دیا گیا۔

جناب اقبال احمد سرڈگی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرکے آج کے مسابقتی دور میں آگے بڑھ رہے ہیں، اردو داں حضرات اور اردو کے تعلیمی اداروں کا فرض بنتا ہے کہ وہ معیار قائم کریں۔ جناب وہاب عندلیب نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم سے بچے کو فطری طور پر میدان میں ترقی و ترویج کا موقع ملتا ہے اور تعلیم کے بنیادی اصول میں مادری زبان ہی کی اہمیت ہے۔

جناب امجد جاوید نائب صدر انجمن نے تعلیمی فنڈ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ میر شاہنواز شاہین کے شکریے پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کمپیوٹر سینٹر کا جلسہ

● نئی دہلی، 5 رمارچ۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت وشوکرما نگر (جھلمل) میں چلائے جارہے کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. سینٹر، کیلی گرافی سینٹر اور ڈپلوما ان اردو لینگویج اسٹڈی سینٹر کے اسٹاف اور طلبہ و طالبات کی طرف سے دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر جناب شعیب اقبال کو ایک استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت جمنا پار وکاس بورڈ کے چیئرمین اور ایم ایل اے ڈاکٹر نریندر ناتھ نے کی۔ استقبالیہ تقریر فرید احمد نے کی۔ ابتدا میں حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے جنرل سکریٹری سید فاروق احمد نے ان مراکز کی کارگزاری سے حاضرین کو روشناس کرایا۔ اس موقعے پر جناب شعیب اقبال نے کہا کہ قومی اردو کونسل کی وجہ سے آج اردو زبان پوری طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی سے منسلک ہوگئی ہے اور آج اردو داں طبقے کو روزگار کے مواقع میسر ہورہے ہیں۔ ڈاکٹر نریندر ناتھ نے کہا کہ ان سینٹروں کی کارکردگی دن بدن بہتر ہوتی جارہی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ملازمتیں بھی مل رہی ہیں۔ فرید احمد نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے مراکز کھولنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اردو داں طبقے کو ان سے فائدہ حاصل ہو۔ (ڈاک سے)

مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات

● کولکاتہ۔ 2001 کی مطبوعہ اردو کتابوں پر مغربی بنگال اردو اکادمی نے مندرجہ ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے۔ ہندستان گیر پیمانے پر مندرجۂ ذیل اردو کتابوں کو انعامات دیے گئے ہیں۔

(الف) مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات ''انا کو آنے دو'' احمد صغیر، ''ہومیو پیتھی کے نسخے'' مترجم پریم پال اشک، مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات ''پیاس کا صحرا'' مبینہ امام، ''جواز وانتخاب'' کوثر مظہری، ''معلومات کا سمندر'' رحمانی سلیم احمد اور مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام ''چھوٹی گڑیا'' عادل حیات کو دیا گیا ہے۔

مغربی بنگال کی سطح پر 2001 کی مطبوعہ کتابوں پر مبلغ پانچ ہزار روپے کا انعام ''مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک'' ڈاکٹر محمد کاظم کو دیا جبکہ مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات کے لیے ''سید حرمت الاکرام۔ حیات وخدمات'' ڈاکٹر ایس جی آئی حیدر، ''شاعرات بنگالہ حیات وخدمات'' ڈاکٹر الف انصاری، مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات ''تحمیص و تجزیہ'' ڈاکٹر یوسف تقی، ''اونچائیوں سے اترتی صدا'' پروفیسر ابونصر غزالی، ''سگ گزیدہ'' ڈاکٹر حسین احمد زاہدی، ''نئی صدی کی بیٹی'' جلیل عشرت کو چنا گیا ہے۔

2001 میں معیاری، علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات ''مکتبہ پیامِ تعلیم'' جامعہ نگر، نئی دہلی اور انشا پبلی کیشنز، کولکاتہ کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● سرینگر، 9 رمارچ۔ غلام نبی ظہور کے 24 ویں یوم وفات کے موقعے پر پلوامہ میں کلچرل اکادمی سرینگر، محکمہ اطلاعات پلوامہ اور محفل بہار ادب شاہورہ کے اشتراک سے کشمیری زبان و ادب میں ان کی خدمات پر ایک روزہ سیمینار سنٹرل ہائی اسکول، پلوامہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر علی محمد میر مصدر نے کی۔ رشید راشد، حمید اللہ حمید اور رشید صدیقی نے غلام نبی ظہور کی زندگی اور شاعری پر مقالے پیش کیے۔ مقررین نے غلام نبی ظہور کی کشمیری زبان وادب

کے تئیں خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی شاعری و ادبی خدمات کا کماحقہٗ جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر غلام نبی ظہور کی شائع شدہ کتابوں اور قلمی نسخوں کی بھی نمائش کی گئی۔ بعد ازاں مشاعرہ شروع ہوا جس کی صدارت شریف الدین پرواز نے کی۔ (ڈاک سے)

● کالی کٹ۔ ایس.سی.ای.آر.ٹی کیرالا کے شعبۂ اردو کی طرف سے کالی کٹ میں ''اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے مسائل۔ طریقۂ کار بحیثیت ثانوی زبان'' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح ریاستی حکومت کے وزیر تعلیمات جناب ای.ٹی.محمد بشیر نے کیا۔

اس موقعے پر صدر شعبۂ نصاب پروفیسر سی.گوکل داس پلے، ڈاکٹر سجاد حسین، پی محمد کٹی، پی کے عبدالحمید، پی.جی.عبدالرحمٰن نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر غوث محمد الدین اور اردو ریسرچ آفیسر امین فخر الدین کٹی نے جلسے کی صدارت کی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت انجمن اساتذۂ اردو کے صدر جناب ٹی محمد نے کی۔ (ڈاک سے)

● کٹک، 27/فروری۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اڑیسہ کی طرف سے طلبہ کے لیے مختلف انعامی مقابلے منعقد کیے گئے۔ ان مقابلوں میں اسکول اور مدارس کے ایک سو سے زائد طالب علموں نے حصہ لیا۔ جناب سعید رحمانی، جناب حفیظ اللہ نیو لپوری، جناب عبدالحق بیتاب اور جناب خاور نقیب نے جج کے فرائض انجام دیے۔ مقابلوں کے اختتام پر تقسیم اسناد کی تقریب منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر سید مشتاق علی اور فیاض احمد فیضی (پروگرام کوآرڈی نیٹر، ای ٹی وی اردو، ممبئی) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس تقریب میں خاور نقیب کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالے ''ترویج'' (خصوصی مطالعہ۔ ڈاکٹر اسلم حنیف) کی رسم رونمائی، ڈاکٹر سید مشتاق علی اور فیاض احمد فیضی نے انجام دی۔ جن طلبہ و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا ان کے نام درج ذیل ہیں۔ شاہانہ ناز، نازیہ بیگم، محمد حمزہ سعید، کہکشاں تسلیم، اکرم خاں، آسیہ بی بی، داؤد خاں، مرزا اسلم بیگ، نایاب پروین اور مشتری بیگم۔ انجمن ترقی اردو ہند (اڑیسہ کے سکریٹری خاور نقیب نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● کشمیر اردو رائٹرز فورم کا اجلاس زیر صدارت ہمدم کاشمیری منعقد ہوا۔ جس میں مظفر ایرج، رفیق راز، شفق سوپوری، شجاع سلطان، سید رضا اور دیگر شعرا اور ادبا نے شرکت کی۔ اجلاس میں دیگر ادبی معاملات پر غور کرنے کے علاوہ اردو کے سرکردہ نقاد، افسانہ نگار اور شاعر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین مقرر کیے جانے پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ مقررین نے حکومت ہند کے اس فیصلے کو اردو دوستی سے تعبیر کرتے ہوئے فاروقی صاحب کی تقرری کو کونسل اور اردو زبان و ادب کے لیے نیک فال قرار دیا۔

(ڈاک سے)

● کالی کٹ، 5/مارچ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کیرالا میں اردو پڑھنے والے 50 سے زیادہ طلبہ کی تعداد والے اسکولوں کے لیے ایس سی ای آر ٹی کے ذریعے مفت کتابیں فراہم کرائی ہیں۔ ان کتابوں کی تقسیم ریاست کے وزیر تعلیم جناب ای ٹی محمد بشیر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس جلسے کی صدارت جناب ٹی محمد صدر انجمن اساتذۂ اردو، کیرالا نے کی۔ استقبالیہ خطبہ ایس سی ای آر ٹی (اردو) کے ریسرچ آفیسر جناب این معین الدین کٹی نے پیش کیا۔ آخر میں انجمن اساتذۂ اردو کیرالا کے نائب صدر جناب کے پی ولایودھن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● ویلور، 24/مارچ۔ بشیر الحق کی کتاب ''حضرت قطب ویلور اور ان کے خلفا کے علمی و ادبی کارنامے'' کا اجرا 26/جنوری کو ہوا جس میں شہر کے شاعروں اور ادیبوں، طلبہ اور دیگر عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

مشاعرہ

● نئی دہلی، 24/مارچ۔ مشیر جھنجھانوی کی یاد میں پندرہ روزہ ''قومی قافلہ'' کی طرف سے ایک مشاعرے کا انعقاد غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں کیا گیا، جس کی صدارت اردو اکادمی کے وائس چیئرمین م.افضل نے کی، جبکہ معروف ادیب و شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ مشیر جھنجھانوی کی بیٹی اور شاعرہ عفت زریں نے شمع روشن کی۔ جسٹس سردار علی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اردو مرکز دوحہ قطر کے صدر سلیمان دہلوی، عظیم اختر، رشید چودھری اور ضیاء الدین سوز نے مہمان خصوصی کے طور پر مشاعرے میں شرکت کی۔ نظامت معین شاداب نے کی۔ اس موقعے پر گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، ملک زادہ منظور احمد اور م.افضل نے مشیر جھنجھانوی کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں عہد ساز شخصیت قرار دیا۔ ''قومی قافلہ'' کی جانب سے حامد خضر نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان میں گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، ظفر جنگ پوری قاسمی، صالحین فہمی، معین شاداب، ملک زادہ منظور احمد، مظفر رزمی، کوثر زیدی کیرانوی، شہباز ندیم ضیائی، منیر ہمدم، شاہد انجم، اقلیم دانش، حسین عالم، رؤف رضا، مخدوم زادہ مختار عثمانی، اقبال اشہر، انور باری، نور جہاں ثروت، ثمر نور پوری اور عفت زریں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

□□□

تبصرہ وتعارف

اردو مرثیے کا ارتقا/ڈاکٹر مسیح الزماں

صفحات:468، قیمت:136 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: احمد کفیل

''اردو مرثیے کا ارتقا'' ابتدا سے انیس تک، اردو میں رثائی ادب کی تنقید پر مشتمل ایک معتبر کتاب ہے۔ رثائی ادب کے ناقد کی حیثیت سے ڈاکٹر مسیح الزماں محتاج تعارف نہیں۔ موصوف نے بڑی جدو کاوش کے بعد اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اسی سعی وحنت کا نتیجہ ہے کہ آج اردو کے معتبر قلم کار رثائی ادب پر کچھ لکھنے کے لیے جب قلم اٹھاتے ہیں تو مذکورہ کتاب کے حوالے کے بغیر اپنی بات مکمل نہیں سمجھتے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1968 میں منظر عام پر آیا تھا اس کے بعد اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن بتدریج 1983 اور 1992 میں شائع کیا۔ اس کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اسے قومی اردو کونسل نے شائع کیا ہے۔

مرثیے نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، تنوع اور وقار بخشا ہے۔ دیگر شعری اصناف کی طرح مرثیہ نگاری بھی فارسی سے ہمارے ادب میں داخل ہوئی لیکن اردو میں مرثیے نے اپنی جو شناخت قائم کی اس کی نظیر فارسی یا عربی میں بھی نہیں ملتی۔ ہماری تہذیبی اور معاشرتی روایتوں کی گود میں پرورش پا کر مرثیے نے زندگی کی حقیقتوں کو ہر عہد میں اپنے زاویۂ نظر سے پیش کیا۔ اس صنف نے ہماری اخلاقی وروحانی قدروں اور حیات وکائنات کے مختلف زاویوں کو بڑی باریکی سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اردو شاعری میں گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ اور ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر مرثیہ نگاروں نے پیش کیا۔ ایک وقت تھا کہ لوگ مرثیے کو محض مذہبی تقدس اور عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھتے تھے اور ظاہر ہے جہاں مذہب اور عقیدت حائل ہو وہاں بے لاگ تنقید کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اولاً عبد الغفور نساخ نے ''انتخاب نقص'' میں انیس و دبیر کے مرثیوں پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات''، مولانا حالی نے ''مقدمۂ شعر وشاعری'' اور مولانا شبلی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں مرثیے کے معنوی پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ پھر شبلی کے موازنے کی تردید میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ امداد امام اثر کی کتاب ''کاشف الحقائق'' سے مرثیے کے ادبی پہلوؤں کی طرف قاری کی توجہ مرکوز ہوئی۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کی کتاب ''اردو مرثیے کا ارتقا'' ابتدا سے میر انیس تک مرثیہ نگاری کی تاریخ پر مبنی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول دو ذیلی ابواب میں منقسم ہے۔ دکن میں ایرانی اثرات اور دہلی میں عزاداری اور مرثیہ گوئی۔ دکن میں مرثیے کی ابتدا قطب شاہی عہد میں عزاداری سے کی گئی ہے اور پہلا مرثیہ گو محمد قلی قطب شاہ کو قرار دیتے ہوئے قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے نمایاں مراثی کو اخلاقی، تہذیبی، سماجی، ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دکن میں دور مغلیہ میں ہاشم علی برہان پوری سے درگاہ قلی سالار جنگ تک کا جائزہ لینے کے بعد دہلی میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دہلی کے نمایاں مرثیہ نگاروں میں فضلی، مسکین، محب، سودا، میر، میر حسن، حیدر بخش حیدری کے مراثی کا جائزہ لینے کے بعد اس عہد کی مرثیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب لکھنؤ میں عزاداری سے شروع ہوتا ہے۔ دور آغاز میں نمایاں مرثیہ نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب دور تعمیر پر مشتمل ہے جہاں خلیق، فصیح، ضمیر اور دلگیر جیسے شعرا مرثیے کی ایک مضبوط بنیاد قائم کر رہے تھے۔ چوتھے باب میں مرثیے کے دور عروج کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس عہد میں مرثیے کے اہم ستون میر انیس اور ان کی مرثیہ نگاری، فصاحت، جذبات نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جنگ کے بیانات، انفرادی جنگ، مناظر قدرت، اخلاقی پہلو، مکالمے اور ان کے نظریۂ شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں مرزا دبیر اور ان کے اہم معاصرین کا ذکر ہے۔ دبیر اور ان کی مرثیہ نگاری میں خیال بندی، مضمون آفرینی، صنائع بدائع، سادگی بیان، جدت پسندی، جنگ اور بین وغیرہ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ عشق اور تعشق کی مرثیہ گوئی اور اصلاح زبان کے جائزے پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔ چھٹے باب میں مرثیے کا فنی اور معنوی ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مرثیے کی ظاہری ساخت میں ہیت، ساخت، اجزائے ترکیبی اور داخلی ساخت میں المیہ کا نقطۂ نظر، ایپک اور مرثیہ، کلاسیکی تصور، نشاۃ الثانیہ کی رسم پرستی، جدید تاریخی تنقید، حقیقت نگاری، ہندوستانی رسوم اور مرثیے کے کردار، منظر نگاری یا فضا آفرینی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور ہر باب کے آخر میں متعلقہ باب کا محاسبہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں نے اردو مرثیے کی ابتدا دکن میں محمد قلی قطب شاہ سے کی ہے اور نصیر الدین ہاشمی کی تحقیق ''نوسرہار'' کے مصنف اشرف بیابانی کو اردو کا پہلا مرثیہ گو قرار دینے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے رشید موسوی کا بیان دہراتے ہوئے ''نوسرہار'' کو ''شہادت نامہ'' محض قرار دیا ہے۔ ادب کے قاری جانتے

ہیں کہ اردو کی شعری اصناف میں "شہادت نامہ" کا کوئی وجود نہیں۔ مرثیے کی شناخت ہیئت کی بجائے موضوع کے اعتبار سے ہوتی رہی ہے اور بیانِ شہادت مرثیے کا خاص موضوع ہے۔ جہاں تک ظاہری ساخت کا سوال ہے تو قدیم دور میں یہ متعین نہیں تھی۔ مربع، مخمس وغیرہ کی ہیئت میں مرثیے لکھے جاتے تھے۔ لہٰذا موضوع یا ہیئت کسی بھی اعتبار سے "نوسرہار" کو مرثیے سے خارج کرنا درست نہیں۔ کچھ ایسے ہی اعتراضات مرثیے کی تشکیل جدید اور سراپا کے بیان میں بھی کیے جاسکتے ہیں۔

"اردو مرثیے کا ارتقا" سے قبل دکن میں مرثیے کے ارتقا کا جائزہ تو لیا جاچکا تھا لیکن دہلی میں مرثیہ نگاری کا جائزہ اس کتاب سے قبل نہیں ملتا۔ اس کتاب میں دکن سے لے کر دہلی اور لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کے دورِ عروج تک جس تفصیل کے ساتھ ان علاقوں میں ہندستانی و ایرانی اثرات اور وہاں کی عزاداری کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور جن تاریک گوشوں پر سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے وہ اپنے طرز کی پہلی کوشش ہے، اور اس کے لیے بلاشبہ مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب کے آخر میں شخصیت اور مقامات کا اشاریہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ عام قاری یا محققین کے لیے یہ اشاریہ اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔

•

وادیِ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں / سر مورٹمر وھیلر

مترجم: زبیر رضوی

صفحات: 148، قیمت: -/45 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ظفر احمد نظامی

پیشِ نظر کتاب مصنف نے 1961 میں تحریر کی تھی۔ اس مدت میں بالخصوص تہذیبِ سندھ، اس کے پھیلاؤ، عہد کے تعین اور اس کے اختتام کے حالات سے متعلق قابلِ قدر نئی شہادتیں سامنے آئی ہیں کیوں کہ ہندستانی، پاکستانی، انگریز، فرانسیسی اور امریکی محققین ان موضوعات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں اس لیے ان کے نتائج عام دلچسپی کے حامل ہوسکتے ہیں۔

وادیِ سندھ کی تہذیب عالمی تہذیبوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم اس کے بیان سے پہلے مصنف نے دعوا کیا ہے کہ "تہذیب کا طلوع میسوپوٹامیا میں ہوا جہاں مسیح سے لے کر ساڑھے تین ہزار سال قبل اڑک عہد میں مندروں کا حساب کتاب سب سے پہلے مٹی کی تختیوں پر کندہ تصویروں یا دیگر علامتوں کی صورت میں رکھا جاتا تھا۔" اسی لیے مصنف نے ہمالیہ کے جنوب میں تہذیب کے آغاز کا جائزہ لینے میں میسوپوٹامیا کو بنیادی حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

سندھ اور میسوپوٹامیا کی تہذیبوں کے بنیادی فرق کے پیشِ نظر مصنف کے نزدیک "اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کسی نزدیکی ربط کے باعث تہذیبی اختلاط عمل میں آیا ہو۔۔۔ کم از کم اپنے مادّی پہلوؤں کے اعتبار سے سندھ کی تہذیب کا فوری آغاز بلوچ یا ایرانی سرحدی خطے سے ہوا۔"

مصنف کے مطابق سندھ کی تہذیب کے بارے میں سب سے واضح علم موہن جوداڑو اور ہڑپا سے ہوا ہے جو اس تہذیب کے سب سے بڑے شہر تھے۔ یہ دونوں شہر شہری منصوبہ بندی کے واضح اور ترقی یافتہ خطوط پر تعمیر کیے گئے تھے۔

مصنف نے تصویروں کی مدد سے موہن جوداڑو اور ہڑپا میں واقع ٹیلوں، قلعوں، محلوں، مینار، حمام، تالاب، غلے کے گودام، افسروں، پیشواؤں کی رہائش گاہوں، گلیوں، بازاروں، عمارتوں، کنوؤں، سڑکوں، نالیوں اور دیواروں کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فنِ تعمیر کے جو نشانات بچے ہیں ان سے اس کا بہت ہی سادہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ممکن بلکہ اغلب ہے کہ سادہ تعمیر کے ساتھ ساتھ لکڑی کا بہت سا کام ہوتا تھا۔ اگرچہ لکڑی کے آثار کہیں بھی زمین کی سطح کے اوپر نہیں بچے ہیں لیکن اس کے استعمال کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

مصنف نے سندھ کی تہذیب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اس کے باشندوں، ان کے فنون اور ہنر، برآمد شدہ مہروں، مجسموں، اوزاروں، ہتھیاروں اور مٹی کے برتنوں پر روشنی ڈالی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سندھ کی تہذیب میں مٹی کے برتنوں سے عام تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ بڑی کاریگری کے ساتھ انھیں بڑے پیمانے پر تیار کیا جاتا تھا۔

سندھ تہذیب سے قبل کے تمدن کے ابتدائی دور میں مصنف نے ہڑپا، موہن جوداڑو کی نشاندہی کی ہے۔ اس تہذیب کی وسعت اور اس کی اقتصادی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ کوٹ دیجی، کالی بنگا، موہن جوداڑو اور لوتھل کی کھدائیوں کی بنا پر اور دیگر مآخذ کی بنیاد پر انھوں نے لکھا ہے کہ 1916 میں انھوں نے یہ اندازہ کیا تھا کہ "سندھ کی تہذیب زیادہ سے زیادہ 2500 قبل مسیح وجود میں آئی ہوگی اور 1500 قبل مسیح تک اختتام پر پہنچی ہوگی۔" لیکن اب انھوں نے اس عہد کو 2300 سے 1750 قبل مسیح تک متعین کردیا ہے۔

اس تہذیب کے اختتام کا سبب مصنف کے بقول قتلِ عام اور سیلاب ہوسکتا ہے۔ تہذیبِ سندھ سے متعلق تفصیلات پر روشنی ڈالنے کے بعد مصنف نے اس کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے تمدنوں کا جائزہ لیا ہے جو

شمال مغرب، سوراشٹر، وسط ہند کے ساتھ ہی گنگا کی تہذیب، شمال مغربی سرحد، سلطنت، مشرقی، وسطی اور جنوبی ہندستان کے تمدنوں کا جائزہ لیا ہے۔ غرض چھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب معلومات کا ایک خزانہ ہے جسے تاریخ کے شائقین کے لیے ایک تحفے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس کا ترجمہ اردو کے نامور دانشور اور ممتاز شاعر زبیر رضوی نے بے حد دلنشیں انداز میں کیا ہے۔

●

سور داس کے روحانی نغمے/جعفر رضا زیدی (شیلیش زیدی)

صفحات: 263، قیمت: -/91 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: رئیس احمد

''سورداس کے روحانی نغمے' ہندی کلاسکی ادب کے مشہور و معروف نغز گو سورداس کے ایک سو ایک روحانی اور نمائندہ نغموں (پدوں) کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ جعفر رضا زیدی کے بقول ان پدوں کے انتخاب میں انھوں نے سور داس کے کلیات (سور ساگر) کے مختلف مطبوعہ نسخوں کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ انتخاب ترتیب و تدوین کے جملہ اصول و ضوابط سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معیاری شعری انتخاب ہے۔ اس کے مطالعے سے بھکتی کال اور بھکتی آندولن کے زیر اثر تخلیق شدہ ہندی کلام پر بھی مختصراً روشنی پڑتی ہے۔

سورداس کی شاعری کو بظاہر شری کرشن کی وصف بیانی تک ہی محدود رکھا گیا ہے جس میں شری کرشن کے بچپن کی اٹھکھیلیوں، جوان العمری کی کہانیوں، کرشن اور رادھا کی راس لیلاؤں کے علاوہ گوپیوں کے ساتھ کی گئی شرارتوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن سورداس زماں و مکاں اور تہذیبی روایات سے بھی قطعاً بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے متعدد شعری نغموں (پدوں) میں اپنے عہد کے ظالم و جابر حکمرانوں کی طرف سے اپنی رعایا اور عوام کے تئیں برتی جانے والی بے اعتنائیوں اور انتظامیہ میں پائی جانے والی بدنظمیوں کے باعث عوام میں موجود اضطراب و انتشار اور ان کی مفلوک الحالی جیسے دلسوز موضوعات اور واقعات کو بڑے پُر درد اور موثر انداز میں شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

اے سور کیسے ہوگا بھلا اس طرح نباہ
سرکار بے لگام ہے' جنتا ہے سب تباہ
راجا کا سور فرض تو ہوتا ہے بس یہی
جور و ستم سے اس کی رعایا نہ ہو دکھی
پہلے تو سور کھولے مہاجن نے جانور
اب چارہ ہضم کرنے پہ آمادہ ہے لعیں

سورداس اپنی زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں کے حل کے لیے کسی حکمراں اور بادشاہ وقت کی جانب نہیں دیکھتے اور نہ ہی کسی سہارے کی اُمید کرتے ہیں بلکہ ہر حال میں وہ اپنے مالک حقیقی سے رجوع کرتے ہیں اور اُسی سے لَو لگاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر بارگاہ خداوندی میں سربسجود رہنا اور عبادت و ریاضت میں معروف و مشغول رہنا ہی ان کے نزدیک ہر مسئلے کا حل ہے۔ اس طرح وحدت و یکتائی کا تصور بھی ان کے کلام میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ تفصیل سے قطع نظر سورداس کی شاعری وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی آمیزش کا اعلا نمونہ ہے۔ ذیل میں بطور مثال چند نغمے پیش ہیں

میرے آقا ہیں اے سور درد آشنا
پائے اقدس کا ان کے ہوں میں مدح خواں
تم ہو علیم، قادر مطلق ہو اے خدا
بے آسروں کا ایک تمھیں تو ہو آسرا
فدا ہو جائیے سور اُس بشر پر
جو دل میں شیام کی الفت بڑھائے
ہو کے خوش آپ جب عاصی پہ کریں گے رحمت
سور کہتے ہیں اُسی وقت اُٹھوں گا یارب
کہتے ہیں سور کر لے ہری کا بھجن بد عقل
دُکھ جل کے راکھ ہوں گے دھلیں گے سبھی گناہ

آخری دو پدوں میں لفظ 'عاصی' اور 'عقل' کی 'ع' گر رہی ہے۔ اس طرح الف کا گرنا تو جائز ہے لیکن 'ع' کا نہیں۔

جعفر رضا زیدی نے ان پدوں کا عام فہم اور آسان اُردو زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ شاعر کا اسلوب و آہنگ برقرار رہے۔ مختصر لفظوں میں اس ترجمے کی فنی خوبی یہ ہے کہ یہ معنوی اعتبار سے مکمل اور مربوط ہے اور سورداس کے شعری بیانات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ مترجم نے اردو منظوم کلام سے قبل اصل متن بھی تحریر کیا ہے' جس سے اس کی ادبی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ یقیناً اس خوبصورت انتخاب کی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

●

اندازِ بیاں اور/ مرغوب حیدر عابدی

صفحات: 111، قیمت: -/150 روپے
ناشر: وسیم پبلشرز، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-2
مبصر: محمود سعیدی

اردو کے مقبول ترین شاعروں کا ذکر چھڑے تو دو نام فوراً ذہن میں آتے ہیں: غالبؔ اور اقبالؔ۔ ان دونوں کی شاعرانہ شہرت برصغیر ہند و پاک کی سرحدیں پار کر گئی ہے اور دنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے کلام کے نہ صرف ترجمے ہو چکے ہیں بلکہ ان کے فکر و فن کی تفہیم و تفسیر میں کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں ایک مشترکہ وصف اور بھی ہے، دونوں نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی قادر الکلام شاعر ہیں۔ لیکن دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ اقبال کی شہرت و مقبولیت میں ان کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ کچھ دوسرے عوامل کو بھی دخل ہے، وہ حکیم الامت کہے جاتے ہیں اور ان کا نام ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے خواب دیکھنے والوں میں ہے لیکن غالبؔ صرف اپنے شاعرانہ قد و قامت سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کا تخاطب مذہب و مسلک کی تفریق کے بغیر پوری انسانیت سے ہے۔

غالبؔ کا کلام اپنے دقیق مضامین اور فارسی آمیز زبان کے باوجود ہندی میں بھی مقبول ہوا ہے اور وقفے وقفے سے ان کا دیوان دیوناگری لپی میں شائع ہوتا رہا ہے لیکن یہ کام علمی انداز میں کم ہوا ہے اور تجارتی مقصد سے زیادہ۔ حاشیوں میں مشکل الفاظ کے جو معنی دیے جاتے ہیں وہ بھی بالعموم غلط ہوتے ہیں کیونکہ مرتب اردو شعریات سے ناواقف محض ہوتا ہے۔

جناب مرغوب حیدر عابدی اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے یکساں شغف رکھتے ہیں اور انھوں نے دونوں کی اعلا تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر وہ خود شاعر ہیں اس لیے شاعری کے رمز شناس بھی ہیں۔ غالب ان کا پسندیدہ شاعر ہے، اس سے پہلے انھوں نے "غالب ایک سو ایک" کے نام سے غالبؔ کے ایک سو ایک منتخب اشعار دیوناگری لپی میں منتقل کر کے شائع کرائے تھے، اب مزید ایک سو ایک شعروں پر مشتمل یہ کتاب شائع کی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام اشعار دیوناگری کے علاوہ اردو رسم الخط میں بھی ہیں۔ ہر شعر پہلے اردو میں پھر دیوناگری میں ہے یعنی اولیت اس زبان کے رسم الخط کو دی گئی ہے جس میں شعر کہا گیا ہے۔ کتاب چونکہ ہندی کے قارئین کے لیے ہے اس لیے شعروں کی ترجمانی ایسی زبان میں کی گئی ہے کہ ان کے مفہوم تک بہ آسانی پڑھنے والوں کی رسائی ہو سکے، ایسی زبان جو شعریت کی بجائے 'نثریت' لیے ہوئے ہے۔ اشعار میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں، ان کے معنی متن سے الگ حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔ اس کی دوگونہ افادیت ہے، اردو سے ناواقف قاری اردو کے بہت سے لفظوں ہی سے نہیں، ان کے محلِ استعمال سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ غالبؔ کا مشہور شعر ہے:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

لیکن غالب کے شعروں کا زیرِ نظر انتخاب عابدی صاحب کی رسوائی کا نہیں بلکہ ان کی نیک نامی کا موجب ہوگا کیونکہ اس سے ان کے دل کا جو معاملہ کھل کر سامنے آتا ہے وہ ان کی سخن فہمی ہی نہیں غالب فہمی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

ایک دو جگہیں کتاب میں ایسی بھی ہیں جہاں نظر ٹھٹک جاتی ہے مثلاً غالبؔ کا مشہور مقطع ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس کے مصرعِ ثانی میں 'خیال' کی جگہ 'فریب' چھپا ہوا ہے اور شعر کی تشریح بھی یہاں 'فریب' کا لفظ سمجھ کر ہی کی گئی ہے۔ یہ سہوِ کلامِ غالب کے عابدی صاحب جیسے دلدادہ سے کیوں کر ہوا، کہنا مشکل ہے۔ امید ہے کتاب کی اگلی اشاعت میں موصوف ایسے مقامات پر نظرِ ثانی کر لیں گے۔

کتاب کا مقدمہ عابدی صاحب نے خود تحریر کیا ہے جس میں کلامِ غالب کی اہم خصوصیات کا ذکر ہے۔ 'دو شبد' میں پریم گوپال متل نے عابدی صاحب کے ادبی کاموں کا تعارف کرایا ہے اور ان کے حسنِ انتخاب کی داد دی ہے۔ سرورق جو چار رنگوں میں ہے غالبؔ کی تصویر اور ان کے اشعار سے مزین ہے۔

•

مشتاق احمد یوسفی (ایک مطالعہ)/ مظہر احمد

صفحات: 188، قیمت: -/150 روپے
ناشر: کتابی دنیا، 1995، گلی نواب مرزا محلہ قبرستان، ترکمان گیٹ، دہلی-6
مبصر: محمد نوشاد عالم

زیرِ تبصرہ کتاب میں مرتب نے اردو ادب کے صاحب نقد و نظر حضرات کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کو یکجا کیا ہے۔ ان میں آل احمد سرور، محمد حسن، نامی انصاری، مجیب الاسلام، شان الحق حقی، آصف فرخی، احمد جمال پاشا، محمد احسن فاروقی اور خود مرتب مظہر احمد کے نام اہم ہیں۔ مظہر احمد نے اپنے مقدمے میں مشتاق احمد یوسفی کی تنقیدی بصیرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'مشتاق احمد یوسفی سے انٹرویو' ہے جو آصف فرخی

نے لیا ہے۔ دوسرا مضمون شان الحق حقی کا ''یوسفی صاحب'(خاکہ) ہے جس میں انھوں نے ''چراغ تلے''، ''زرگزشت'' اور ''آبِ گم'' کے موضوعات اور فن و تکنیک کو موضوع بنایا ہے۔

احسن فاروقی نے اپنے مضمون'' مشتاق احمد یوسفی۔ ایک مزاح نگار'' میں مزاح کے مختلف پہلوؤں اور یوسفی کی مزاح نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے بقول ''مشتاق احمد یوسفی رشید احمد صدیقی کی طرح یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ مزاح ہمارے یہاں بھی علمیت، سنجیدگی، ذہانت اور سچی ذکاوت (Wit) سے تعلق رکھتا ہے، محض پھکڑ بازی نہیں ہے بلکہ ایسی ہنسی یا مسکراہٹ ہے جس کا اثر جس قدر سوچتے جاؤ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔'' احمد جمال پاشا نے اپنے مضمون'' مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت'' میں اردو ادب میں طنز و مزاح کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی کے پیش رو اور معاصرین کا سرسری محاسبہ کیا ہے۔

''مشتاق احمد یوسفی۔ ایک طنز نگار'' میں شاہد عشقی نے مغربی ناقدین کی آرا سے بحث کرتے ہوئے طنز و ظرافت کی انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں دونوں میں سے کسی ایک کی غیر موجودگی میں اس کی کمیوں اور خامیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے رشید احمد صدیقی اور پطرس کی روایات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ طنز آمیز مزاح یا مزاح آمیز طنز کے علاوہ خالص مزاح کے بھی بہت سے اعلا نمونے پیش کیے ہیں۔'' مشتاق احمد یوسفی۔ ایک انشائیہ نگاری'' میں مقالہ نگار نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر رشید احمد صدیقی نہ ہوتے تو مشتاق احمد یوسفی بھی نہ ہوتے۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام نے'' مشتاق احمد یوسفی کا فن'' میں انگریزی ادب کے ادیب سوئفٹ اور ہیزلٹ کا تقابل مشتاق احمد یوسفی سے کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یوسفی دل کے اعتبار سے مشرقی اور فکر کے نقطۂ نظر سے مغربی ہیں۔ غرض جو مقام انگریزی ادب میں سوئفٹ اور ہیزلٹ کا ہے وہی اردو میں مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔

آل احمد سرور نے'' آبِ گم۔ ایک تاثر'' میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ بعد ازآں مشتاق احمد یوسفی کو مزاحیہ ادب کی آبرو کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی بھی آبرو تسلیم کیا ہے۔ ''ست رنگے لمحوں کا تاجدار۔ مشتاق احمد یوسفی'' میں محمد حسن نے ان کی نثر نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کے بقول'' اردو نثر کو جو تہہ داری، بلاغت، درد مندی اور کیفیت آفرینی کی قوت یوسفی کی تحریروں سے ملی اس کی نظیر کم سے کم اردو کی ادبی تاریخ میں موجود نہیں۔''

''فن یوسفی'' میں نامی انصاری نے مزاحیہ ادب کے موجودہ عہد کو مشتاق احمد یوسفی کا عہد کہا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نثر نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تحریروں کے اجزائے ترکیبی میں شگفتہ نگاری، اسلوب کی انفرادیت، تہہ داری، انشا پردازی اور تخلیقی زبان کے برمحل استعمال کو شامل کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے چاروں مجموعوں پر بحث کی ہے۔

کتاب کا آخری مضمون مظہر احمد کا ہے جس میں مشتاق احمد یوسفی کو مزاح نگار اور پیروڈی نگار ثابت کرنے کے ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کے مختلف اسالیب، زبان و بیان، انگریزی الفاظ کے استعمال اور لفظی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے جیسی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ بہ اعتبار مجموعی یہ کتاب مشتاق احمد یوسفی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتی ہے۔

□□□

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی / مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوندا س / مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

گرجارانی استھانا

بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "کچھ اور مختصر کہانیاں" سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔

اس کتاب میں ارسطو، گیلیلیو، پاسچر، ڈارون، نیوٹن، میری کیوری اور آئنسٹائن جیسے شہرہ آفاق سائنسدانوں کے بارے میں واقفیت فراہم کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے بچوں کو نہ صرف ان سائنسدانوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی بلکہ ان ایجادات سے بھی واقف ہونے کا موقع ملے گا جنھوں نے انسان کو نت نئی سہولیات فراہم کیں۔ کونسل کی شائع کردہ 52صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 13 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ایک آدمی کا کام

لان میں کھیلتے ہوئے راہل نے سنیل کو دیکھا جو گھر سے اپنے بلّے، وکٹ اور گیند لیے نکل رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچا اور پوچھا "سنیل بھیا! کیا تم کرکٹ کھیلنے جارہے ہو؟"

"ہاں"

"کیا میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" راہل نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے نہیں" تم چھوٹے ہو۔ ہم بڑے لڑکے بہت بُری طرح کھیلتے ہیں۔"

"اچھے بھیا! اگر میں کھیل نہیں سکتا تو کچھ تو کرسکتا ہوں۔ میں تم لوگوں کے لیے گیند پکڑوں گا۔"

راہل نے اصرار کیا۔ وہ آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"نہیں۔ ہم کارک کی گیند سے کھیلتے ہیں جو بہت سخت ہوتی ہے۔ تمھیں چوٹ لگ جائے گی۔" کرکٹ کے سامان کو اپنی سائکل پر رکھتے ہوئے سنیل نے کہا اور تیزی سے چلا گیا۔

راہل اس کو تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ 'اوہ! وہ سائیکل کتنی تیز چلا سکتا ہے!' اس نے سوچا۔ سنیل اُس کا ہیرو تھا اور وہ اُس کی پرستش کرتا تھا۔ اُس کے لیے یہ ایک ناپسندیدہ بات تھی کہ سنیل ہمیشہ اُسے بچے کی طرح سمجھتا تھا اور اس بات سے اُسے چڑ تھی۔ وہ اپنے آپ سے بولا" میں اب بچہ نہیں ہوں۔ میں اگلے مہینے نو سال کا ہوجاؤں گا۔ میں بس اسٹاپ سے اکیلا گھر آجاتا ہوں۔ کبھی کبھی ماں مجھے مدر ڈیری سے دودھ لانے کے لیے بھیج دیتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں پیڑ پر بھی چڑھ سکتا ہوں جو کہ سنیل بھیا بھی نہیں کرسکتے۔

راہل پہلی منزل پر رہتا تھا جب کہ سنیل اُسی بنگلے کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ راہل اپنے ماں، باپ اور دادی کے ساتھ رہتا تھا۔

سنیل جو چودہ سال کا تھا اپنے والدین، دادا، دادی اور ایک بڑے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کے والد کی شہر میں جواہرات کی ایک بڑی دکان تھی۔

کیوں کہ راہل کے ماں اور باپ دونوں کام پر جاتے تھے، وہ اپنا وقت زیادہ تر اپنی دادی کے ساتھ گزارتا تھا۔ اڑوس پڑوس میں راہل کی عمر کے چند ہی بچے تھے۔ سنیل کبھی کبھی راہل کے ساتھ کھیل لیتا تھا۔

ایک روز سنیل نے راہل سے اعتماد سے کہا'' میں نے کل اسکول میلے میں ٹینس کی ایک گیند جیتی ہے۔ وہ میں نے تمھارے لیے رکھ دی ہے۔ تمھارے لیے اُس سے کرکٹ کھیلنا اچھا رہے گا۔''

''لیکن بھیا! میں اب چھوٹا بچہ نہیں ہوں۔'' راہل ایک دم سے بھنا کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔ اتنے جوشیلے مت ہو۔''

سنیل اُس کے اس طرح اچانک پھٹ پڑنے سے مزہ لے رہا تھا۔ میں آج سہ پہر میں خالی ہوں۔تم آنا۔ ہم مونوپولی (Monopoly) کھیلیں گے۔تم میرے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا سکتے ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں ابھی اوپر جاتا ہوں اور اپنے کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔''

راہل تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ اسکول کا بستہ اتار کر پھینکا اور اپنے کپڑے بدلے۔

ٹی شرٹ اور موزے پہنتے ہوئے وہ زور سے بولا

''دادی'' میں سنیل بھیا کے گھر مونوپولی کھیلنے جا رہا ہوں۔ میں دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں گا۔'' یہ سب کرنے میں صرف چند منٹ لگے اور جلدی ہی وہ سنیل کے گھر کے سامنے والے دروازے پر تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اُس نے دوبارہ زیادہ دیر تک گھنٹی بجائی۔ اُس نے دروازے سے اپنے کان لگائے اور بند دروازے کے پیچھے اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ اب بھی بند تھا۔'' عجیب بات ہے'' راہل نے سوچا۔ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی تو سنیل بھیا نے مجھے بلایا تھا اور اب دروازہ نہیں کھول رہے ہیں۔''

وہ پیچھے کی طرف دوڑا۔ اُس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بھی بند ہے۔ تب وہ سنیل کے کمرے کے بائیں طرف بھاگا۔ وہ کھڑکی پر گیا جو بند تھی اور جس پر کالا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ اچانک اُس نے ایک آواز سنی۔

''کون ہے، وہاں کون ہے؟'' یہ سنیل کی آواز تھی۔لیکن وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔

''یہ میں ہوں راہل، تم نے مجھے بلایا اور اب......''

''شش......'' سنیل جلدی سے بیچ میں ہی بولا۔'' راہل تمھیں ہماری مدد کرنا ہے۔ یہاں اندر ڈاکو ہیں۔''

''ڈاکو، کیا اُن کے پاس پستول ہیں؟''

''ہاں، اُن کے پاس ہیں۔ جب میں یہاں آیا وہ یہاں موجود تھے۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور میری دادی کے ساتھ مجھے اس کمرے میں بند کرادیا۔''

''کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' راہل بولا۔

''پھر پولیس کو اطلاع کردو۔ کیا تم ایسا کرسکتے ہو؟''

''اوہ، یقیناً۔''

کنارے کنارے چلتے ہوئے راہل آہستہ سے دروازے سے باہر آ گیا، پھر وہ اپنی پوری طاقت سے بھاگا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے پولیس والوں کو دیکھا اور فوراً ہی بولنا شروع کردیا۔

''جناب، برائے مہربانی میرے ساتھ چلیے۔ میرے گھر ڈاکو آگئے ہیں۔ میرا مطلب ہے میرے دوست کے گھر میں۔ میرا مطلب ہے سنیل بھیّا کے گھر......''

''تم کیا گپ مار رہے ہو بچے؟'' ہمارا وقت خراب مت کرو، ہمارے پاس تمھاری شرارتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔'' اس گرمی میں آوارہ پھرنے کے بجائے اپنے گھر واپس جاؤ۔'' ایک پولیس والا بولا اور اپنا رجسٹر لکھنے میں لگ گیا۔ دوسرا پولیس والا ٹیلی فون پر بات کررہا تھا۔

''ہر لمحہ قیمتی ہے۔'' راہل نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا کہ کاؤنٹر پر ایک گھڑی رکھی ہے۔ اُس نے گھڑی اُٹھائی اور بھاگنا شروع کردیا۔ ایک منٹ کے لیے پولیس والے چکرا گئے۔ دو پولیس والے راہل کے پیچھے چیختے ہوئے دوڑے۔'' ارے، تم چور، گھڑی واپس کردو نہیں تو ہم تمھیں جیل میں بند کردیں گے۔''

سڑک خالی پڑی تھی۔ اس لیے کوئی دوسرا اس کا پیچھا کرنے میں شامل نہیں ہوا۔ جب تک راہل گھر کے دروازے تک پہنچا تو پولیس والوں نے اُسے پکڑ لیا۔

''جناب، مہربانی کرکے غصہ مت ہوئیے۔ میرا ارادہ آپ کی گھڑی چرانے کا بالکل نہیں تھا۔ میں نے یہ ترکیب صرف آپ کو یہاں تک لانے کے لیے کی تھی۔''

پولیس والوں کا غصہ اب کچھ کم ہوا۔ ایک نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور پین نکالے اور کچھ لکھا۔ پھر اس نے وہ صفحہ پھاڑ کر راہل کو دیا اور بولا'' بیٹے، دوبارہ سے پولیس واپس دوڑ کر جاؤ جتنا تیز تم دوڑ سکتے ہو اور یہ وہاں پولیس والے کو دے دو۔ مجھے بتاؤ وہ گھر کون سا ہے؟

''سیدھے گھر کے بائیں طرف جاؤ اور وہاں کھڑکی پر کھٹکا کرو۔ سنیل بھیّا وہاں پر ہیں۔'' راہل نے جواب دیا اور پوری رفتار سے

چوکی کی طرف بھاگا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ وہاں دوبارہ موجود تھا۔ پولیس والا راہل کو دیکھ کر چلایا۔ "اے شریر لڑکے وہ گھڑی کہاں ہے؟"

"اوہ" میرا یقین کیجیے، میں کوئی چور نہیں ہوں۔ اس کو جلدی سے پڑھ لیجیے، آپ کے دوست نے یہ بھیجا ہے۔"

راہل نے پولیس والے کو وہ پرچا دیا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی پولیس والے نے اُسے پڑھا وہ حرکت میں آگیا۔ اُس نے وائرلیس پر کوئی پیغام دیا۔ جلدی ہی پولیس کا ایک اُڑن دستہ وہاں پہنچ گیا۔ راہل اور وہ پولیس والا دونوں جیپ میں سوار ہو گئے۔ جب وہ سنیل کے گھر پہنچے تو پہلے ہی وہاں موجود پولیس والے انھیں مل گئے اور انھیں اطلاع دی کہ "ڈاکو ابھی تک اندر ہیں، اُن میں سے دو پستولوں سے لیس ہیں۔ وہ سب چار ہیں۔"

پولیس نے خاموشی سے گھر کی ناکہ بندی کر لی۔

کچھ دیر بعد سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص پستول لیے برآمد ہوا۔ اُس نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا اور کسی کو نہ پاکر اپنے ساتھیوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ تین اور آدمی باہر آئے۔ ایک کے پاس ٹاٹ کا تھیلا تھا دوسرے شخص کے پاس ایک پستول تھا، اور تیسرا خالی ہاتھ تھا۔ جیسے ہی انھوں نے دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ انسپکٹر چلایا "پکڑو!" اور پولیس پارٹی نے حملہ کر دیا۔

ڈاکو جو اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ جلدی ہی ان پر قابو پا لیا گیا اور انھیں نہتا کر دیا گیا پھر پولیس نے انھیں گرفتار کر کے جیپ میں ٹھونس دیا۔ پولیس والے جو ڈاکوؤں کے ساتھ تھے جیپ میں ہی رہے اور باقی لوگ گھر کے اندر گئے۔ انھوں نے سنیل اور اُس کی دادی کی رسّیاں کھولیں پھر وہ دوسرے کمرے میں گئے وہاں انھوں نے سنیل کی ماں اور دادا کی رسیاں کھولیں۔ اُس کے دادا ڈاکوؤں کے ساتھ ہاتھا پائی میں زخمی ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ڈاکوؤں نے سنیل کے گھر کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی تھی اس لیے ایمبولینس کو وائرلیس کے ذریعے بلایا گیا۔

اسی دوران وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ راہل نے پوری روداد سنائی۔ بیچ کی باتوں کو سنیل اور اُس کی ماں نے پورا کر دیا۔ پولیس انسپکٹر نے راہل کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا " آپ سب کو اپنے بچائے جانے کے لیے اس چھوٹے بچے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ اُس کی حاضر دماغی تھی کہ آپ لوگ بچ سکے۔"

سنیل راہل کے پاس آیا اور بولا " ارے، میں نے تمھیں ہمیشہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سمجھا، لیکن تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ تم نے یقیناً ایک بڑے مرد کا کام کیا ہے۔"

راہل کے لیے یہ سب سے زیادہ خوشگوار لمحہ تھا۔ اب وہ سنیل بھیا کے لیے کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سنیل بھیا، کیا میں اب آپ کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے آسکتا ہوں؟" اُس نے شرماتے ہوئے سوال کیا۔

سنیل نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

□□□

قومی اردو کونسل کی سالانہ میٹنگ کے موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب گوہر رضا، جناب زبیر رضوی، ڈاکٹر علی جاوید اور جناب مدالفضل۔

گذشتہ دنوں غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ماہنامہ "سائنس کی دنیا" کے سابق ایڈیٹر جناب محمد خلیل کو غالب انعام 2004 برائے علمی خدمات (سائنس) دیا گیا۔
اس موقعے پر ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی جناب محمد خلیل کو ٹرافی دیتے ہوئے۔

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

نیو ہندستانی ـــ انگلش ڈکشنری

[illegible]

صفحات: 1216، قیمت: -/418 روپے

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب: کلیم الدین احمد

[illegible]

قیمت: مکمل سیٹ -/3400 روپے

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا

[illegible]

قیمت: -/1555 روپے

تاریخ ادب اردو

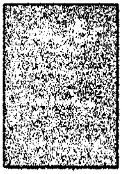

مرتب: سیدہ جعفر، گیان چند جین

[illegible]

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

[illegible]

(مکمل سیٹ: چار جلدوں میں)

صفحات: 2728، قیمت: -/794 روپے

آثار الصنادید (مکمل تین جلدوں میں)

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم

[illegible]

صفحات: 1138، قیمت: -/717 روپے

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتب: ظل عباس عباسی / تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ

[illegible]

صفحات: 870، قیمت: -/336 روپے

کلیاتِ پریم چند

مرتب: مدن گوپال

[illegible]

22 جلدوں کی قیمت: -/3395 روپے

نوٹ:- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔